پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن

محمد افتخار شفیع

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر اسلم انصاری

شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر اسلم انصاری

شخصیت اور فن

محمد افتخار شفیع

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	فخر زمان
منتظم	محمد عاصم بٹ
تدوین وطباعت	سعیدہ درانی
اشاعت	2010
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	العصر پرنٹرز پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/210روپے
	غیر مجلد: -/200روپے

ISBN: 978-969-472-254-0

Pakistani Adab Ke Mamar

"Dr. Aslam Ansari : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

Muhammad Iftikhar Shafi

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

نگرانِ اعلیٰ	فخر زمان
منتظم	محمد عاصم بٹ
تدوین وطباعت	سعیدہ درانی
اشاعت	2010
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	العمر پرنٹرز پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/210روپے
	غیر مجلد: -/200روپے

ISBN: 978-969-472-254-0

Pakistani Adab Ke Mamar

"Dr. Aslam Ansari : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

Muhammad Iftikhar Shafi

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی و ادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے ساٹھ کی دہائی شاعری کا آغاز کیا۔ انہوں نے شاعری کی روایتی اسالیب سے وابستہ رہ کر جدّت کی نئی راہیں نکالیں۔ وہ ایک صاحب طرز شاعر، بالغ نظر نقاد، سنجیدہ ماہر اقبالیات اور اہم محقق ہیں۔ ان کے اظہار کا وسیلہ بننے والی زبانوں میں اردو، فارسی اور انگریزی شامل ہیں۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ''ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کے معروف شاعر، نقاد اور محقق افتخار شفیع نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری ڈاکٹر اسلم انصاری کی فن و شخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

یہ کتاب ڈاکٹر اسلم انصاری کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

ملتان شہر میں میری جوانی کے دس قیمتی سال دفن ہیں۔ وہیں رہ کر مجھے محبتوں اور نفرتوں کے مابین فرق کا اندازہ ہوا۔ محبتوں کے اسی سلسلہ ہائے کوہ میں ڈاکٹر اسلم انصاری ماؤنٹ ایورسٹ نہ سہی لیکن کے۔ٹو کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ دلفریب اور مسحور کن شخصیت کے مالک ڈاکٹر اسلم انصاری کی تہ در تہ کرشاتی شخصیت کا راز جاننے میں مجھے ایک عرصہ لگا۔ شروع میں ان کے چہرے پر آراستہ نیلے شیشوں والی عینک ان کی جمالیاتی حدود و قیود کی نشان دہی کرتی دکھائی دی۔ یہ انکشاف بہت بعد میں ہوا کہ ان کی عالمانہ بصیرت اور تخلیقی قوت ہی دراصل ان کی ہر دل عزیزی کا راز ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اُردو، فارسی، سرائیکی اور انگریزی کے عہد ساز شاعر ہیں۔ ایک بالغ نظر اور وسیع المطالعہ نقاد اور اقبالیات کے نئے جزیروں کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی معیت میں ''فاران اکادمی'' ملتان کے تحت انھوں نے نوجوان نسل کی ایک کھیپ بھی تیار کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت اور فن پر کام کرنا میری دیرینہ خواہش تھی۔ جب اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے مجھے اس کام کا مژدۂ جاں فزا سنایا گیا تو طمانیتِ قلب کے ساتھ ساتھ مجھے ایک خوف بھی لاحق ہوا۔ وہ یہ کہ مختصر ضخامت کی اس کتاب میں ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنا کیسے ممکن ہوگا؟ میرے خیال میں یہ تو بہ ذاتِ خود موجودہ عہد کے شعور کو نئی آنکھ سے دیکھنے والی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر اسلم انصاری کا نام آتے ہی سمرقند اور بخارا کی تہذیب سے وابستہ ملتان اپنی بھرپور مٹھاس کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری پورا

ملتان ہیں۔ انھیں ادبی، تہذیبی اور علمی ملتان کا نمائندہ کہنا مناسب ہوگا۔ سو مختلف مراحل طے ہوئے اور کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں برادرم ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان صاحب نے میری بھرپور معاونت کی۔ انھوں نے نہ صرف ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتابوں کی فراہمی ممکن بنائی بلکہ مختلف مراحل پر مجھے اور ''تیز قدم'' بھی کیا۔ اس طرح کی عنایت وہ اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں۔ میں مکرم و محترم جناب فخر زمان چیرمین اکادمی ادبیاتِ پاکستان کا دلی طور پر ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے نہایت شفقت کے ساتھ مجھے یہ کام کرنے کا موقع عطا کیا۔ محترمہ سعیدہ درانی صاحبہ نے ہر مرحلے پر ایک عمدہ منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ کم صفحات کی وجہ سے کتاب کے حوالہ جات کو اقتباسات کے ساتھ ہی درج کر دیا گیا ہے۔ جب کہ کتابیات آخر میں دی گئی ہیں۔

یہاں میں اپنی اہلیہ اور بچوں (احمد افتخار، مہر علی، اور حمزہ افتخار) کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے میری ضروریات کا خیال رکھا اور میرے کام میں مخل ہونے کی بجائے مجھے ایک اچھا ماحول فراہم کیا۔ خدائے محمد ﷺ ان کی توفیقات میں اور اضافہ فرمائے (آمین)

محمد افتخار شفیع

ڈاکٹر اسلم انصاری کا خاندانی پس منظر

بہار رخصت ہو چکی تھی، آم کے درختوں پر کوئل کی نغمہ سرائی کا موسم آنے والا تھا۔ پیرانہ سالی کے دکھوں کی ماری، فصیل شہر خود کو پھر سے موسموں کی شدتوں کو سہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ بہاء الدین زکریاؒ کے روضے کی جالیوں سے باہر جھانکنے والی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا۔

اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک خوشگوار دن، بیرون پاک گیٹ (ملتان) کے ایک پرانی طرز کے مکان میں حاجی قاسم علی کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ نومولود کا نام محمد اسلم رکھا گیا، یہی محمد اسلم بعد میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام سے علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہوا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے اجداد ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ ملتان میں ایک نئی طرز فکر کو متعارف کروانے میں اس خاندان کا نہایت اہم کردار ہے۔ شروع دن سے گھر کا ماحول مذہبی اور ادبی تھا۔ جس آبائی گھر میں ان کی پرورش ہوئی وہ گرد و نواح میں ''پھولوں والی حویلی'' کے نام سے مشہور تھا۔ خبر نہیں ریاست لوہارو کی حویلیوں کی طرح گرمیوں کی راتوں میں ''پھولوں والی حویلی'' کے صحن میں بھی پھولوں سے لدے پودوں پر پنکھے جھلنے کا رواج تھا کہ نہیں البتہ یہ طے ہے کہ گھر کے مکین گہری نیند کے جلو میں معطر خواب دیکھیں یا کتابوں کے لازوال خزانے سے باتوں کو خوشبو سے آراستہ کریں، ان کی نفاستیں ضرور ضرب الامثال بن جاتی ہیں۔ اسلم انصاری نے بھی کتابوں سے تعلق کا آغاز اسی ''کتابوں اور گلابوں والی حویلی'' سے کیا۔ خود رقم طراز ہیں: ''میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میرا گھر ہر قسم کی علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی کتابوں سے اٹا ٹوٹ بھرا پڑا تھا

۔لیکن میں نے جس پہلی کتاب کو بغیر اُستاد کی مدد کے خود بہ خود پڑھنا شروع کر دیا تھا وہ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی شائع کردہ داستان امیر حمزہ کی ایک دلچسپ تلخیص تھی جو ابوالاثر حفیظ جالندھری کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی''(تکلمات، ص ۱۸)

ابوالاثر کی تلخیص شدہ ''داستان امیر حمزہ'' کے اثرات اسلم انصاری پر یوں مرتب ہوئے کہ ان کا ذہنی افق وسیع اور روشن ہوتا چلا گیا۔ اسلم انصاری نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور ایمرسن کالج ملتان (موجودہ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ) میں ایف۔اے میں داخلہ لے لیا۔ اسی تاریخی درس گاہ سے اسلم انصاری نے ۱۹۵۷ء میں ایف۔اے اور ۱۹۵۹ء میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ اعلیٰ تعلیم کی خواہش انہیں لاہور لے آئی۔ اسلم انصاری نے آغاز میں ایم۔اے انگریزی کے طالب علم کی حیثیت سے ایف۔سی کالج میں داخلہ لیا، لیکن پھر اسے ادھورا چھوڑ کر اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی چلے آئے۔ یہاں ایم اے اردو میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سجاد باقر رضوی جیسے اساتذہ نے ان کی غیر معمولی ذہانت، وسعت مطالعہ اور ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انہیں ''شاگردِ خاص'' کا درجہ عطا کیا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی ان دنوں کی پرانی یادوں کو یوں کھنگالتے ہیں:

''اس وقت کے پرنسپل اور صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم، اپنے علمی و تنقیدی مضامین کچی پنسل سے لکھا کرتے تھے اور پھر مختلف نشانوں سے مربوط کرتے ہوئے، بین السطور اور حاشیوں پر پیچ و خم عبارتوں کا اضافہ کرتے چلے جاتے تھے۔ ان مضامین کی عبارتوں اور اضافوں کے ربط ضبط کو سمجھ کر سید صاحب کے حسبِ منشا انہیں صاف کر کے لکھ دینا عام استعداد کے کسی طالب علم کے لیے ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ یہ کام اسلم انصاری کے سپرد ہوا کرتا تھا اور وہ اپنے موتیوں جڑے سوادِ خط میں اس خوبی سے ان مضامین کی تبیض کر دیا کرتے تھے کہ سید صاحب کا جی خوش ہو جاتا تھا۔''(گفتگو کا چراغ، ص ۱۲)

اورینٹل کالج میں تعلیم و تعلّم کے عرصے میں اسلم انصاری کا قیام وولنر ہاسٹل میں رہا۔ اپنی خوش

اخلاق، خوش خطی، اور خوش گلوئی کی وجہ سے وہ کالج کے ممتاز ترین طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ ان دنوں کی ایک خوش کن یاد ''شمع تاثیر'' مشاعرے کے سالانہ مقابلے میں انور مسعود (معروف مزاحیہ شاعر) کے ساتھ اورینٹل کالج کی نمائندگی تھی۔ اس مقابلے میں انور مسعود نے نظم اور اسلم انصاری نے غزل پڑھی اور فاتحین کے لیے رکھی گئی شمع جیت لائے۔ اس غزل کا ایک شعر ان کی فنی پختگی کا گواہ ہے:

شرارِ زندگی بھی کیا چراغِ زیرِ داماں ہے
بہاروں میں بھی گل شعلہ بجاں معلوم ہوتے ہیں

اورینٹل کالج کے دنوں میں ہی اسلم انصاری کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی۔ یہ رسم و راہ جلد دوستی میں بدل گئی، اسلم انصاری نے ابتدائی طور پر ناصر کاظمی کی غزل سے فریاد کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کا اسلوب سیکھا۔ ناصر کاظمی نے کئی برس جونیئر ہونے کے باوجود اسلم انصاری کو اپنا ہم عصر قرار دیا ہے۔ اپنی ابتدائی شاعری پر ناصر کاظمی کے اثرات کا اسلم انصاری بھی اعتراف کرتے ہیں، لیکن ان کا موقف ہے کہ اس کی وجہ دوستی کا رشتہ بنا لیکن مسلسل غزل کی بات ناصر کاظمی نے مجھ سے متاثر ہو کر کہی۔ ناصر کاظمی کی کتاب ''پہلی بارش'' کا نام بھی اسلم انصاری کا تجویز کردہ ہے۔ اورینٹل کالج لاہور سے ۱۹۶۲ء میں ایم۔ اے اردو کے امتحان میں اسلم انصاری نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہاں بطور لیکچرار کے تدریسی امور بھی انجام دیے۔ اسی دوران انہوں نے پی۔ سی۔ ایس کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن ملازمت جوائن نہ کی۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ان کا لیکچرار (اردو) کی حیثیت سے تقرر ہوا اور جنوبی پنجاب کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ ملتان آرٹس کونسل کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۷۶ء میں بطور اسسٹنٹ پروفیسران کی ترقی ہوئی، ۱۹۷۹ء میں انہیں گورنمنٹ کالج ملتان (بوسن روڈ) بھیج دیا گیا۔ تب سے اپنی ریٹائرمنٹ ۱۹۹۹ء تک وہ اسی کالج میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج ملتان میں اسلم

انصاری کی معروف نقاد جابر علی سید سے گہری رفاقت رہی۔ ان دنوں کی یادیں آج بھی اسلم انصاری کے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔ اسلم انصاری کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ وہ عموماً گھر میں ''معتکف'' رہتے ہیں۔ یہ بات کلی طور پر درست نہیں۔ لاہور میں قیام کے دنوں میں احباب کے ہمراہ ان کی ٹی ہاؤس، لارڈز اور گارڈ نیتا جیسے مجلسی مقامات پر محفلیں بجتی رہیں، ملتان میں بھی وہ شیزان ہوٹل، شب و روز، کمپنی باغ کے کیفے ٹیریا اور حسین آگاہی کے دہلی مسلم ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ ''چائے خانوں'' کی رونق کا سبب بنے رہے۔ البتہ بعد میں تنقید و تحقیق کے شعبے میں آنے اور گھریلو مصروفیات کے سبب یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری نے ملتان میں شعور کی آنکھ کھولی اور ساری عمر یہیں گزار دی۔ ایسا نہیں کہ ''ہنگامہ شہر'' کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا۔ البتہ ملتان جیسے سنہری شباہتوں کے شہر میں بھی انہیں عموماً اپنی تنہائیاں ہی عزیز رہیں، عمر گو سایۂ تاک میں گزری لیکن پتے پتے کی زبان جاننے کا تجربہ ڈاکٹر اسلم انصاری کی زندگی کا ماحصل ہے، البتہ یہ بغیر خریداری کی نیت کے بازار سے گزرنے والی بات ہے:

همه شهر پُر زخوباں منم و خیال ماہے
چه کنم که نفس بدخو نه کندبه کس نگاہے

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی منظر کشی کرتے ہوئے جاوید اصغر لکھتے ہیں:

''اسلم ایک اچھے شوہر ہیں، بہت زیادہ ہم درد، معاونت کرنے والے، روٹھ کر مان جانے والے اور درگزر کرنے والے۔ پلاؤ، شامی کباب اور اچھا پکا ہوا ہر کھانا ان کا پسندیدہ ہے۔ کوٹ پتلون اور شلوار قمیض دونوں طرح کا لباس وہ موقع کی مناسبت سے زیبِ تن کرتے ہیں۔''

مشرقی اقدار کے رسیا اور مذہبی نظریات کے شیدا ڈاکٹر اسلم انصاری مسلم تہذیب و تمدن اور

اسلامی آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم کے گہرے مطالعے اور ان پر مضبوط گرفت رکھنے والے اسلم انصاری صوفیائے کرام کی انسان دوستی کے جذبے اور صلح کل کے تصور کو بھی پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی خاموشی سے شعروسخن کی مملکہ کے دل میں گھر کیا ہے۔ شہرت اور اظہارِ ذات ہر کسی کی خواہش ہے۔ خود ربِ کون و مکاں کے تخلیقِ کائنات کے عمل کے پس منظر میں اپنا انکشاف کرنا مقصود تھا۔ جب کُل میں یہ خوبیاں ہوں تو جزو میں اس کی کسی حد تک جھلک ممکن ہے۔ خود کو منوانے کے لیے انسان نے کیا کیا نہیں کیا ہے۔ تاج محل بنوائے ہیں، بڑے بڑے اہرام تعمیر کیے ہیں۔ اپنی بادشاہی اور کج کلاہی منوانے کے لیے خود حضرتِ انساں کی قبا کو چاک کیا ہے۔ یہی خواہش اگر کم ترین لوگوں کے ہاں پیدا ہو تو اس کے حصول کے لیے وہ انسانیت کے مقام سے بھی گر جاتے ہیں۔ اسلم انصاری نے کبھی بھی یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ تعلقاتِ عامہ کے شعبے سے ان کو علاقہ نہیں۔ وہ ادب میں بھی مقدار سے زیادہ معیار کے قائل ہیں۔ اور اسی فارمولے کو دوستوں کے چناؤ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کی فطری تساہل پسندی کی وجہ سے بہت سے اہم اور ضروری کام اکثر و بیشتر ادھورے رہ جاتے ہیں۔ دوستوں کے استفسار پر وہ محبوبانہ انداز میں ''حافظہ نباشد'' کہہ کر ان کی تشفی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے شاعری، تنقید و تحقیق، اقبالیات، کالم نگاری اور ڈراما نگاری کے میدان میں خود کو ملتان کی نمائندہ شخصیت کے طور پر منوایا ہے۔ ان کا تعلق تو ملتان سے ہے لیکن ان کے افکار و نظریات کے اثرات قومی سطح پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں اسلم انصاری پورا ملتان ہیں۔ ملکی منظرنامے میں تاریخی تہذیبی اور ادبی حوالے سے جو مقام ملتان کا ہے، اسلم انصاری کو بھی اپنے ہم عصر شعرا و ادبا پر وہی فوقیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کا سوانحی خاکہ

پورا نام: محمد اسلم انصاری

قلمی/ادبی نام: اسلم انصاری

تاریخ پیدائش: ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء (ملتان)

والد حاجی قاسم علی تیمی الانصاری

والدہ: محترمہ گلزار جہاں بیگم

تعلیم: ۱۹۵۵ء میٹرک فرسٹ ڈویژن بہ امتیاز

۱۹۵۷ء ایف اے فرسٹ ڈویژن ایمرسن کالج، ملتان (موجودہ گورنمنٹ کالج)

۱۹۵۹ء بی اے (آنرز) فرسٹ ڈویژن بہ امتیاز ایمرسن کالج، ملتان

۱۹۶۲ء ایم اے (اردو) سیکنڈ پوزیشن اورینٹل کالج، لاہور

۱۹۸۵ء ایم اے (فارسی) فرسٹ کلاس بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۱۹۹۲ء ایم فل (اردو) فرسٹ کلاس (گولڈ میڈل) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۹۹۸ء پی ایچ ڈی (اردو) بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ملازمت ۱۹۶۳ء اپریل سے ۱۹۶۳ء ستمبر (بطور لیکچرار) اورینٹل کالج لاہور

۱۹۶۳ء ستمبر سے ۱۹۶۵ء (بطور لیکچرار) گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ

۱۹۶۴ء پی سی ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی لیکن بوجوہ ملازمت جوائن نہ کی

۱۹۶۵ء چھ ماہ کی تعیناتی (بطور لیکچرار) گورنمنٹ انٹر کالج، ملتان (موجودہ سول لائنز کالج)

۱۹۶۶ء پنجاب پبلک سروس کمیشن سے محکمہ تعلیم میں مستقل بنیادوں پر تقرر ہوا

۱۹۶۶ء گورنمنٹ کالج ملتان (بوسن روڈ) میں کچھ عرصہ تدریسی امور انجام دیے

۱۹۶۶ء جون سے ۱۹۶۶ء اکتوبر۔ گورنمنٹ انٹر کالج بھکر

۱۹۶۶ء اکتوبر سے ۱۹۷۰ء مارچ۔ گورنمنٹ ایس ای کالج بہاولپور

۱۹۷۰ء مارچ سے ۱۹۷۵ء۔ گورنمنٹ کالج ملتان (بوسن روڈ)

۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء (ڈیپوٹیشن) ریزیڈنٹ ڈائریکٹر آرٹس کونسل، ملتان

۱۹۷۶ء بطور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی

۱۹۷۹ء سے ریٹائرمنٹ تک۔ گورنمنٹ کالج ملتان (بوسن روڈ)

۱۹۸۹ء بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ترقی ہوئی

۲۰۰۶ء بطور وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ سرائیکی بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۲۰۰۷ء سے اسی شعبے میں مشیرِ تحقیق کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شادی: ۱۹۷۵ء میں محترمہ نسرین اختر سے کی

اولاد تین بیٹے: قاسم، آصف اور مسعود

کتب ۱۔ KAFEES کے عنوان سے خواجہ غلام فریدؒ کی منتخب کافیوں کا انگریزی ترجمہ

(بہ اشتراک جیلانی کامران) مطبوعہ بزمِ ثقافت ملتان ۱۹۶۹ء

۲۔ خواب و آگہی (شعری مجموعہ) مطبوعہ کاروانِ ادب ملتان ۱۹۸۲ء

۳۔ اقبال عہد آفریں (اقبالیات) مطبوعہ کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۸۸ء

۴۔ نقشِ عہدِ وصال کا (شعری مجموعہ) مطبوعہ الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء

۵۔ فیضانِ اقبال (منظوم اقبالیات) مطبوعہ مجلسِ فکرِ اقبال، ملتان ۱۹۹۷ء

۶۔ چراغِ لالہ (فارسی مثنوی) ۱۹۹۶ء

۷۔ Lotus and the Sandwaves (Poems & Plays)

A.D. 1997

۸۔ شعر و فکرِ اقبال (اقبالیات) مطبوعہ مجلسِ فکرِ اقبال، ملتان ۱۹۹۹ء

۹۔ تکلمات (ادبی کالم) مطبوعہ فکشن ہاؤس، لاہور ۲۰۰۰ء

۱۰۔ بیڑی وِچ دریا (سرائیکی ناول) ۲۰۰۲ء

۱۱۔ نگارِ خاطر (فارسی مثنوی) مطبوعہ ناشران خاوران، لاہور ۲۰۰۶ء

۱۲۔ ادبیاتِ عالم میں سیرِ افلاک کی روایت (تنقید) مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۲۰۰۶ء

۱۳۔ اردو شاعری میں المیہ تصورات (مقالۂ ڈاکٹریٹ) مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۲۰۰۸ء

۱۴۔ چوہدری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی'' سوانح اور فکری و فنی مطالعہ (تنقید و تحقیق) مطبوعہ دارالکتاب، لاہور ۲۰۰۸ء

تحقیقی مقالہ جات (مطبوعہ)

اردو کے مختلف رسائل و جرائد میں بیاسی کے قریب تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

اعزازات

۱۔ حبیب بینک ادبی ایوارڈ (قومی) ۱۹۶۹ء

۲۔ خواجہ فریدؒ ادبی ایوارڈ ۱۹۸۲ء

۳۔ احمد ندیم قاسمی ایوارڈ (شاعری) ۱۹۸۵ء

۴۔ فیض احمد فیض ایوارڈ (شاعری) ۱۹۸۷ء

۵۔ ملتان ایوارڈ (ثقافت) ۱۹۸۷ء

۶۔ لوحِ تقدیس بہ انضمام سکہ طلائی (فارسی شاعری)

کنگرہ شعرای فارسی گویان، پاکستان (بین الاقوامی) ۱۹۹۱ء

۷۔ ریڈیو پاکستان، گولڈن جوبلی ایوارڈ ۱۹۹۷ء

۸۔ خواجہ فریدؒ ایوارڈ (اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور) ۱۹۹۸ء

۹۔ اعزاز برائے حسنِ کارکردگی (شعبہ: ادب) ضلعی حکومت ملتان ۲۰۰۴ء

۱۰۔ تمغہ حسن امتیاز ۲۰۰۹ء

سیمینار / فنکشن

ملک کے مختلف شہروں میں متعدد ادبی سیمینارز اور تقاریب میں شرکت کی اور تحقیقی مضامین پڑھے۔ مختلف کل پاکستان مشاعروں میں شمولیت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

نصاب میں

۱۔ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۲۔ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

مقالہ جات

۱۔ مقالہ برائے ایم اے اردو:

اسلم انصاری کی غزل، شعبہ اردو یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور ۲۰۰۴ء

۲۔ مقالہ برائے ایم فل اردو: تدوین کلیات اسلم انصاری مع مقدمہ

مرتبہ: میمونہ رب نواز۔ بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۲۰۰۶ء

۳۔ مقالہ برائے ایم فل فارسی: (زیرِ تدوین) ڈاکٹر اسلم انصاری،

''شاعرِ طراز اول فارسی در پاکستان'' خانم سعیدہ بخاری، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۴۔ فارسی مثنوی ''ای بشر، ای ستارۂ غم ناک'' پر نامور جرمن مستشرق اور عالمی شہرت کی حامل

اقبال شناس محترمہ ڈاکٹر این میری شمل کا پیش لفظ

دیگر مشاغل

مصوری، خطاطی

....

جاوید اصغر: گفتگو کا چراغ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۶ء

نیز اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے فراہم کردہ کوائف سے بھی مدد لی گئی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتابیں-ایک تعارف

خواب و آگہی (شعری مجموعہ)

''خواب وآ گہی'' اسلم انصاری کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ یہ۱۹۸۲ء میں کاروانِ ادب ملتان نے شائع کیا۔ دوسو آٹھ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں اسلم انصاری کی انہتر غزلوں اور ستاون نظموں کا بہترین انتخاب شامل ہے۔ یہ شعری مجموعہ خاصی تاخیر سے منظر عام پر آیا۔ ''خواب وآ گہی'' کی اشاعت سے بہت پہلے اسلم انصاری معاصر ادب میں اپنی ایک علاحدہ اور منفرد پہچان بنا چکے تھے۔ پتہ نہیں وہ کون سی مصلحت تھی جس نے انہیں ایک طویل عرصے تک اپنی متاعِ سخن کو اہل ادب سے اوجھل رکھنے پر مجبور کیا۔ شاید اس کی ایک وجہ اسلم کی شاعری کا بہ تدریج وجدانی اظہار اور فکری تجزیے کے قالب میں ڈھلتے چلے جانے کا عمل بھی تھا۔ اسلم انصاری کی شاعری میں ابتدائی طور پر ناصر کاظمی اور اس سے آگے فراق گورکھپوری اور میر تقی میر کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک عہد کا شعور رکھنے والے سخن ور ہونے کی وجہ سے انہیں بہت جلد اس بات کا ادراک ہو گیا کہ اس دشت میں نام پیدا کرنے کے لیے دیوانگی کا کوئی اور باب ہی رقم کرنا پڑے گا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی تخلیقات کے چند برس بعد اسلم انصاری کا ایک اپنا لب ولہجہ ترتیب پاتا ہے۔ اور وہ شعوری طور پر اپنے سینئرز کے مضامین کو ایک ''منقش پہیے'' کی طرح اپنے دائرے میں ہی گھماتے چلے جانے کی بجائے آگے کا سفر کرتے ہیں۔ ''خواب وآ گہی'' کی ابتدائی غزلوں میں ناصر کاظمی کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ذرا ٹھہریے!

یہ وہی غزلیں ہیں جن سے متاثر ہو کر ناصر کاظمی نے ''پہلی بارش'' کے ذریعے اپنے عہد کو سیراب کیا۔ اسلم انصاری کی یہ غزلیں ۶۳-۱۹۶۲ء کے ''ادب لطیف'' میں شائع ہوئی تھیں۔ چند شعری رنگ ملاحظہ ہوں:

یہ بھی کوئی ترکِ وفا ہے
وہ تو اب بھی یاد آتا ہے
تجھ سے آنکھ ملاتا کیسے
تو اس دن جانے والا تھا

''خواب و آگہی'' اونچے اونچے بالا خانوں پر مشتمل ایک ایسا شہر ہے جس کے اردگرد کی فصیل بھی دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط ہے۔ اس ''شہرِ غزل و نظم'' میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں لیکن وہاں سے پلٹنا شاید ناممکن ہے۔ یہ لفظوں کا ایک ایسا طلسمِ ہوش ربا ہے جس میں ''صدیوں کا سفر'' کرنے کے بعد بھی قاری وہیں آ کے رکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کیا تھا۔ اس مجموعے میں شامل شعری مواد کی تفہیم کے لیے قاری کو متعدد بار اپنے شعری وجدان اور فلسفیانہ اندازِ فکر کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کے دھندلی سی چند شبیہیں اس کے سامنے ابھرتی ہیں، جن میں شاید قاری کا اپنا عکس کہیں معدوم ہو جاتا ہے۔

دفعتہً ہم جھیل کی جانب نہ مڑ جاتے اگر
مقبروں تک تو وہی رستہ ہمارے ساتھ تھا
اک تغیر تھا ہمارے پیش و پس صورت فشاں
جاوداں لمحوں کا اک دھوکا ہمارے ساتھ تھا

☆☆☆☆

زینہ زینہ وقت کی تہ میں اتر جائیں گے ہم
ایک دن یہ قلزمِ خوں پار کر جائیں گے ہم

اس کو شاید ہو سکے اندازۂ رنج سفر
چہرے چہرے پر لیے گردِ سفر جائیں گے ہم

☆☆☆☆

اسلم انصاری کی شاعری کا ابتدائی دور اسی انداز کی غزل سے عبارت ہے جو ''خواب و آ گہی'' کا خاصہ ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو غزل کی روایت سے آ گہی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''خواب و آ گہی'' کی نظمیں عصرِ حاضر کے موضوعات اور نظم کی مخصوص ہیئت کی وجہ سے اس کے عالمی سطح پر پھیلاؤ اور حاصل شدہ موضوعاتی تنوع کی بہ دولت کائنات کی حقیقت اور فکر و وجدان کے لامتناہی وسعتوں سے مالا مال دکھائی دیتی ہیں۔ ہر نظم اپنی موجودگی کا جواز فراہم کرتی ہے۔

شہر سے دور
مقابر پہ جھکی شاخ بہار
سر بہ سر خندۂ بے جا بھی نہیں
(شاخ تنہا بھی نہیں)
ایک دو پھول تو ہیں گلشنِ ہستی کے سفیر
ایک دو رنگ تو ہیں لوحِ تمنا کے اسیر
ایک گرتی ہوئی دیوار سے جھانکی تو ہے خوشبو کی کرن
ہدفِ مرگ و عدم کب سے ہے، لیکن پھر بھی
شہر و صحرا میں برابر یہ صدا دیتی ہے
زندگی اپنا ابد آپ بنا لیتی ہے

''خواب و آ گہی'' میں شاعر اسلم انصاری سے ہونے والی ملاقات خاصی خوش گوار اور دل سوزی سے بھرپور صورت حال کو جنم دیتی ہے۔

''اقبال عہد آفریں'' اسلم انصاری کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اقبالیات کے موضوع پر مشتمل سترہ پرمغز اور جامع مضامین کا یہ انتخاب ۱۹۸۷ء میں کاروانِ ادب ملتان نے شائع کیا۔ اقبالیات پر یوں تو متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن اس کتاب کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اس کا مصنف کسی مرحلے پر بھی مرعوب ہوئے بغیر بڑے واضح انداز میں کتاب کے مشمولات کو پہلی بار موضوع بحث بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ''اقبال عہد آفریں'' کے تقریباً سبھی مضامین موضوع و بحث کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود داخلی لحاظ سے مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب کا آغاز ایک خوبصورت فارسی نظم سے کیا گیا ہے۔ یہ نظم اقبال کی فنی اور فکری عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطابق علامہ اقبال کے فنی و فکری جاہ و جلال کے اثرات مشرق و مغرب کے تخصص کے بغیر عالمی سطح پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس ''دیباچہ'' نما نظم میں اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ جلد ایسا وقت آئے گا جب اقبال کی فکر اپنے متاثر کن پہلوؤں کی وجہ سے عالم انسانی کو آگہی عطا کرے گی۔

اس کتاب کے چند اہم مضامین یہ ہیں:

۱۔ اقبال عہد آفریں

۲۔ اقبال کی بیانیہ شاعری

۳۔ اقبال اور عشقِ رسول

۴۔ اقبال کا تصورِ تاریخ (ابن خلدون اور اشپنگلر کے افکار کی روشنی میں)

۵۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اسلامی افکار کے تناظر میں)

۶۔ خطبات اقبال پر ایک نادر تبصرہ

۷۔ فارسی شعر و ادب میں اقبال کی فکری و فنی ترجیحات

۸۔ اقبال کی مختصر ترین مثنوی "بندگی نامہ"

۹۔ اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر

۱۰۔ سنگ وخشت یا افکار تازہ (ایک ریڈیائی تقریر)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی "اقبال عہد آفریں" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اسلم انصاری اقبال کے مداح ہیں اور اسلامی تاریخ وتفکر کا وہ شعور رکھتے ہیں جو اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے اسلم کے یہ مضامین اسلم کی علامہ سے گہری وابستگی کے ساتھ اقبال کی شاعری اور متعلق علوم کے وسیع مطالعے کا ثبوت ہیں"

اقبالیات کے ضمن میں ایک کتاب میں یک جا کیے گئے یہ مضامین اس لیے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں صرف اقبال کی شاعری کو ہی موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بڑی صراحت سے روشنی ڈالتے ہوئے ان کا ایک ہمہ جہت شخصیت کے طور پر تعارف کرایا ہے۔

"اقبال عہد آفریں" میں اسلم انصاری نے جدید مشرقی اور مغربی علوم کا گہرا مطالعہ ہونے کی وجہ سے اقبال کے فن اور شخصیت کا انھی علوم کی مدد سے تعین کرنے کی کوشش کی ہے ایک ذہین نقاد کی طرح اسلم انصاری کو اس بات کا پورا ادراک ہے کہ مستقبل میں "مطالعہ اقبال" کی کون سی نئی صورتیں وقوع پذیر ہوں گی۔

نقش عہد وصال کا (شعری مجموعہ)

"نقش عہد وصال کا" ڈاکٹر اسلم انصاری کا دوسرا مجموعۂ شاعری ہے۔ اس میں اسلم انصاری کی پینتیس غزلیں اور بتیس نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں "غبارِ نغمہ" کے عنوان سے رباعیات اور ایک منظوم تمثیل پر مشتمل گوشہ بھی ترتیب دیا گیا ہے۔ "نقش عہد وصال کا" الحمد پبلی کیشنز لاہور سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے آغاز میں "پیش آہنگ" کے نام سے شاعر نے اپنے شعری نقطۂ نظر کی بھرپور وضاحت کی ہے، لکھتے ہیں:

''وجودیاتی مفہوم میں شاعری میرے لیے ماحول کی گھٹن اور فرسودگی سے نجات پانے کا ذریعہ بھی رہی ہے اور تکمیلِ ذات کا وسیلہ بھی۔ لیکن تخلیقی اور معنوی سطح پر سماج کے بندھنوں سے رہائی پانے کے ساتھ ساتھ شاعری ہی کے ذریعے مجھے انسان اور اس کی اجتماعی حالت (سماج) کی معرفت بھی حاصل ہوئی ہے۔ شاعری نے بہت حد تک حرف و معنی کے وصال و اتصال کے ذریعے ان جدائیوں اور نارسائیوں اور ان ہجرتوں اور فرقتوں کا ازالہ بھی کیا ہے جس سے مشیتِ فطرت کے ہاتھوں ہر انسان کو کم یا زیادہ بہرہ ملتا ہے لیکن شاعری بھی نگار طناز کی طرح شرکتِ غیر کو کم ہی گوارہ کرتی ہے اور بعض اوقات ایک تخلیقی انسان کی زندگی میں ایک شخصی آمر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مادی کامگاری کے ہر امکانی موڑ پر یہ تخلیقی انسان کا راستہ روکتی ہے اور اپنے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کراتی ہے لیکن اس کے شعری آہنگ اور شعری معنویت کی بازگشت جب ملکی حدوں کے اس پار سے بھی سنائی دیتی ہے تو اس نگار طناز کی خود بینی کی تسکین ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اپنی تخلیق کی صداقت پر تخلیقی انسان کا یقین اور پختہ ہو جاتا ہے۔'' (نقشِ عہدِ وصال کا۔ ص ۱۶)

''خواب و آگہی'' سے ''نقشِ عہدِ وصال کا'' تک کا تخلیقی سفر اس مقام بلند کو چھو کر آتا ہے جس کے لیے قدرتِ کلام کی ضرورت ہے۔ اسلم انصاری میں اگر چہ فطری طور پر ایک اہم تخلیق کار تو موجود ہے لیکن بلاشبہ اقبال کی اصطلاح میں یہ تخلیق کار تخلیقی عمل میں ''خونِ جگر'' کی سرخی کو سوادِ تحریر میں بدلنے کے ہنر سے بھی آشنا ہے۔ ذرا تیور دیکھیے:

ہزار حیلۂ تسکیں پہ بے قرار ہی تھا
جنوں ہی کہیے، مگر عشق تازہ کار ہی تھا
چمک اٹھے تھے ستارے سے اس کی پلکوں پر
بچھڑتے وقت وہ ظالم بھی اشک بار ہی تھی

☆☆☆☆

شکستہ پا ہیں مگر پھر بھی چلتے جاتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں؟ گر کر سنبھلتے جاتے ہیں
جدید عہد کی باتیں، نئی صدی کے خیال
ہم ایسے لوگ اسی سے بہلتے جاتے ہیں

☆☆☆☆

اس مجموعے میں اسلم انصاری کی نظم بھی خلاقانہ بصیرت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔اس میں عہد کی روایات سے انحراف کر کے ''اینگری مین'' بننے کی کوشش تو کہیں پر بھی نہیں کی گئی لیکن اس میں انفرادیت کی وہ ہلکی سی لہر ضرور تیرتی دکھائی دیتی ہے جس سے تخلیقی فن پارہ خود اعلان کرتا ہے کہ مجھے اسلم انصاری نے تخلیق کے مرتبے پر فائز کیا ہے۔حیرانی اس بات کی ہے کہ ان کی نظم میں کہیں بھی عصری نظم کی جھلک کا شائبہ تک نہیں ہوتا:

اور اب سوچتا ہوں
کہ اک عمر میں نے
انہیں سبز پتوں، انہیں زرد شاخوں
انہیں سرخ پھولوں کے گرداب میں
ایک سیّال حدت کو ڈھونڈا
مگر کچھ نہ پایا
کئی زخم مہکے، کئی درد چٹکے
مگر شاخِ دل کا مقدر نہ چمکا
وہی سرخ رستوں پہ بکھرے ہوئے سنگ دل سنگ ریزے
وہی آتشیں دائروں میں گھٹی ہوئی مرمریّت

فیضان اقبال (منظوم اقبالیات)

''فیضانِ اقبال'' ڈاکٹر اسلم انصاری کی منظوم اقبالیات کا مجموعہ ہے۔ ۱۰۴ صفحات کی یہ کتاب مجلسِ فکرِ اقبال، ملتان نے ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔ فکرِ اقبال کی جدید شعری تشکیلات پر مشتمل یہ مجموعہ کلام اس لیے بھی اہم ہے کہ اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے والے تخلیقی سرمائے میں اسے اپنے فلسفیانہ موضوعات کی بہ دولت انفرادیت حاصل ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نیا جوشِ عمل اور تصورِ زندگی عطا کرنے والے علامہ اقبال، اسلم انصاری کے مطالعات میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ شاعر نے اقبال کے نیم تمثیلی انداز میں فکرِ اقبال کو جدید عہد پر منطبق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں علامہ اقبال کے ناقدین کے تصورات کو منظوم غنائیے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ''بیابہ مجلسِ اقبال'' ہے۔ اسی طرح ایک گوشے کا عنوان ''اقبال، عالمِ مثال میں'' بھی ہے۔ یہ ایک تصوریہ یا فنطاسیہ (Fantasia) ہے۔ شاعر نے تخیل کے سطح پر براجمان ہو کر اقبال کی تنقید کا نشانہ بننے والے عالمی شہرت یافتہ مفکرین کا دفاع کرتے ہوئے ''مثنوی اسرارِ خودی'' میں ان پر جو کڑی تنقید کی گئی اس کا جواب دیا ہے۔ ان میں یونانی فلاسفر افلاطون اور فارسی کے عظیم شاعر حافظ شیرازی ممتاز اور نمایاں ہیں۔ اسی طرح اس خیالی مکالمے میں اقبال کے معتوبین کے علاوہ دوسرے مفکرین نطشے یا نٹشے اور برگساں وغیرہ کا موقف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس خیالی مکالمے میں کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کی فکر کی توضیح و تشریح کے ساتھ ساتھ بعض مغالطوں کی تردید بھی کی جائے۔ ''فیضانِ اقبال'' کے تیسرے حصے میں فکرِ اقبال کے بعض بنیادی تصورات کی نئی شعری تشکیل کی گئی ہے۔ یہ حصہ اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ فکرِ اقبال کی جدید دور میں تشکیلِ نو کی جو ضرورت ہے اس کو کسی حد تک پورا کیا گیا ہے۔ اسلم انصاری کا کہنا ہے کہ:

''اس تالیف کے بیش تر اجزاء کلامِ منظوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے بارے میں شعریت کا ادّعا خود فریبی کے مترادف ہوگا۔ شاعری اور 'کلامِ منظوم' کا فرق مسلمات

میں سے ہے۔ لیکن دنیا کی اچھی، معیاری اور بڑی شاعری بھی جس کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہر شاعر کی خواہش بھی ہوتی ہو اور کوشش بھی، کلامِ منظوم ہی کی صورت میں پائی جاتی ہے۔'' (فیضانِ اقبال۔ص ۱۴)

''فیضانِ اقبال'' کا شعری آہنگ اپنے جلو میں ایک شاعرانہ عظمت رکھتا ہے۔ مثلاً وہ حصہ دیکھیے جہاں حافظ شیرازی، علامہ اقبال سے ''سخت ست'' ہونے کا طعنہ سننے پر اپنے موقف کا اظہار کرتے ہیں:

سنا ہے مجھ کو بھی کچھ سخت ست فرمایا
اگرچہ بعد میں ''القط'' بھی اس کو ٹھہرایا
مگر عزیزِ گرامی! یہ کیا خیال آیا
کہ مجھ فقیر پہ اس طرح طعن فرمایا!
غلط نہیں تو کہوں میں کہ میرا عودِ غزل
ہوا ہے آپ کے ہاں شاملِ سرودِ غزل
سروشِ غیب کا گہ گاہ ہم زباں ہوتا
کوئی گناہ نہیں میرا خوش بیاں ہوتا
یہ سکر و صحو کے مبحث میں اس قدر شدت
مجھے تو ہوتی ہے اس بات پر بہت حیرت

چراغ لالہ (فارسی مثنوی)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری کا اولین مجموعہ ''چراغ لالہ'' ہے۔ جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ فارسی مثنوی میں مختلف علمی مباحث اور دقیق مسائل پر بڑی خوبصورتی سے بحث کی گئی ہے۔

Lotus and The Sandwaves (Poems & Plays)

انگریزی نظموں اور ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ لائٹ ہاؤس اکیڈمی ملتان کے زیرِ اہتمام

۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر بی۔ڈی۔حیدر اور پروفیسر شفاعت یار خان کے مضامین سے مزین یہ کتاب باسٹھ انگریزی نظموں اور تین انگریزی ڈراموں پر مشتمل ہے۔شفاعت یار خان، اسلم انصاری کی انگریزی شاعری کا تعارف کرواتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"In many of his poems, Mr. Aslam Ansari seems to be asserting that the universe is a series of reflections and shadows, being reduced by his creative self to intelligible correlations" (Lotus and the sandwaves - p 21)

ایک نظم میں اسلم انصاری کا اسلوب ملاحظہ ہو:

O Bard, Sing with me

O Bard who sing with a saddening glee,
Sing with me
Sing of the beloved and love and longing
and make me sing with thee.
Let's sing, playing on the harp together,
of God and man and stars so bright;
Let's sing together attuned
of hope and mercy and light
O Bard, can you hear me sing
of myself with thee?
O let me know if I,m not in tune

with the song you sing with glee

O Bard, dont mix unknowingly

your sighs with your song

Don't ever, while singing of joys of love

Make me cry; it is wrong!

O Bard, I may sing with thee

If only you stay:

Or I may as well come along

with you; what do you say?

O Bard, you've gone far away

with the song you happily sang

Perhaps never to come again hither

Leaving a memory with a pang

ای بشر ای ستارہ غم ناک (فارسی مثنوی)

اسلم انصاری کی دوسری اہم فارسی تصنیف ''ای بشر ای ستارۂ غم ناک'' ہے۔ کم وبیش ساڑھے سات سو اشعار پر مشتمل اس طویل مثنوی میں حدیقا سنائی کی معروف بحر (فاعلتہ فعاعل۔ فعلن) کو آزمایا گیا ہے۔ اس کا موضوع عہد حاضر کی انسانی زبوں حالی ہے۔ کئی ابواب پر مشتمل اس مثنوی میں شاعر نے حالاتِ حاضرہ کو آج کے انسان کے لیے مایوس کن قرار دیا ہے۔ بات صرف ''قنوطیت'' پر رک نہیں جاتی بلکہ شاعر نے ان مسائل سے نپٹنے کے لیے نئے امکانات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ حکیم سنائی کی پسندیدہ بحر میں تخلیق ہوئی ہے لیکن اس میں اسلم انصاری نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اسلم انصاری نے مشرق کی اقدار کا نئے

سرے سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی جمالیاتی پہلوؤں کو نیا زاویۂ نظر دیا ہے۔

ایک جگہ پر مصنف نے اسلامی ادب اور ہندوستان میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر اور ان کی فلسفیانہ اساس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری لاہور کی بادشاہی مسجد اور ملتان، ایران اور وسط ایشیاء کی نقاشی اور کاشی کاری کے کام کو مسلم تہذیب کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ اس مثنوی میں ''دریائے سعادت رواں است'' اور ''ای بشرای ستارۂ غم ناک'' والے حصے زیادہ پر تاثیر اور اثر انگیز ہیں۔ اسلم انصاری کے خیال میں آج کے انسان کی پستی کی وجہ اخلاقی اور روحانی ہے۔ ایک باب میں موجودہ عہد کے شاعروں اور ادیبوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ مشرق و مغرب میں انسانیت کی بقا اور مستقبل کے تابندہ تصورات کی تلاش کریں۔ اسی طرح آج کے انسان کو خوف مایوسی اور ناامیدی سے بچایا جا سکتا ہے۔ مثنوی کے اختتامی حصے کا عنوان بھی ''خطاب بہ آدمِ نو'' ہے۔ اس حصے میں اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو موجودہ انسانیت کے بطن سے ہی ''نیا انسان'' جنم لے سکتا ہے۔ ایک ایسا انسان جو عقل و دانائی کا پیکر ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کے معیارات پر بھی پورا اترتا ہو۔ اسلم انصاری کا یہی ''نیا انسان'' آج کی انسانیت کا خواب ہے۔ اس مثنوی کو سب سے بڑا اعزاز یہ حاصل ہے کہ اس کا دیباچہ معروف مستشرق اور عالمی شہرت یافتہ اقبال شناس ڈاکٹر این میری شمل کا تحریر کردہ ہے۔ مصنف نے یہ کتاب بھی ان کے نام معنون کی ہے۔ اس مثنوی میں اسلم انصاری کی چند غزلیں بھی شامل ہیں، ان غزلوں کو یہ تخصص حاصل ہے کہ انہیں مثنوی کی بحر میں لکھا گیا ہے۔

شعر و فکرِ اقبال (اقبالیات)

مطالعۂ اقبال کے ہمہ جہتی موضوع پر ڈاکٹر اسلم انصاری کے وسیع اور بیش قیمت مضامین کا دوسرا مجموعہ ''شعر و فکرِ اقبال'' کے نام سے ۱۹۹۹ء میں مجلسِ فکرِ اقبال نے شائع کیا۔ اس میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے آٹھ خوبصورت اور جامع مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبالیات کے حوالے سے بعض نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ ڈرامے اور تمثیل سے

انہیں طبعی مناسبت ہے اس لیے انہوں نے اسلامی تہذیب اور ڈرامے کو فکرِ اقبال کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ علامہ اقبال کے مختلف مشاہیر مثلاً مرزا اسداللہ غالب، ولیم شیکسپیئر، اور مرزا بیدل کے فن کے ساتھ فکری انسلاک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''جاوید نامہ'' کی تمثیلی اور علامتی معنویت کی مختلف پرتیں بھی کھولی گئی ہیں۔ مضامین کے اس مجموعے میں'' جاوید نامہ'' کی دو علامتی اصطلاحات'' زندہ رود'' اور'' زروان'' پر مصنف کی بحث انوکھی، قابلِ قدر اور معنی خیز ہے۔ مطالعہ اقبال پر اسلم انصاری کے مضامین کا یہ مجموعہ مختصر لیکن وسیع و عمیق معنویت کا حامل ہے۔ اقبال شناسی کے ضمن میں یہ کتاب اسلم انصاری کے عالمانہ انداز نظر، شاعرانہ پس منظر اور فلسفیانہ طرزِ اسلوب کی بدولت ایک اہم اضافہ ہے اور بلاشبہ اقبالیات کے حوالے سے نئے فنی و فکری تناظرات کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مختار ظفر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ''فروغِ رنگِ گل کا استعارہ'' بنے گی۔

تکلمات (ادبی. فکری اور تہذیبی کالم)

''تکلمات'' ڈاکٹر اسلم انصاری کے اٹھائیس کالموں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ہم کلامی کے عنوان سے اسلم انصاری کے تین بھرپور انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب فکشن ہاؤس لاہور نے ۲۰۰۰ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس کتاب میں زندگی، محبت، انسانیت کی اعلیٰ اقدار، زندگی میں دولت کا مقام، شاعری، ادب، مشاعرے کا ادبی انسٹی ٹیوشن، استاد اور شاگرد کے باہمی تعلق، اور معلم کہ مرشد؟ وغیرہ جیسے موضوعات پر نہایت عمدہ انداز میں اپنا تصور پیش کیا ہے۔

''تکلمات'' کا اندازِ تحریر شاعرانہ ہے۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں شامل کیے گئے کالم محض صحافیانہ تحریریں نہیں۔ اردو ادب اور صحافت کے مابین قدیم رشتوں کے استوار ہونے کی وجہ سے انہیں کالم کا نام دیا گیا ہے، وگرنہ اپنے جمالیاتی اظہاریے اور خوبصورت رنگوں کی کہکشاں جیسے موضوعات کی وجہ سے یہ اردو کے خوبصورت نثر پارے ہیں۔

ان نثر پاروں میں محض لفاظی یا اسلوبِ بیان کی چاشنی ہی نہیں بلکہ زندگی کے حقائق کی تلاش کا عمل اور فلسفیانہ طرزِ فکر کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ اسلوبِ تحریر دیکھیے:

''میر کے لیے ان کی شاعرانہ عظمت حکام کے تقرب کا وسیلہ تھی۔ لیکن وہ اس وسیلے اور تقرب کو خاطر خواہ استعمال نہ کر سکے۔ غالب نے اس وسیلے کو بھرپور انداز سے استعمال کیا۔ لیکن نتائج خاطر خواہ نہ نکل سکے۔ اقبال کے لیے حکام کا تقرب ایک قدرتی سی بات تھی وہ نہ اس کے لیے کوشاں ہوئے اور نہ ہی اس کے حصول پر اس سے بیزار ہوئے۔ اور کبھی بھی اس تقرب کو اپنی عظمت کا نقیض نہیں بننے دیا۔ اور بعض اوقات تو ''قربِ سلطانی'' کی دولت اور ''عطائے شاہی'' کی نعمت دونوں کو ٹھکرا دیا، لیکن اس ٹھکرانے میں کبر ونخوت کا شائبہ نہیں بلکہ عزتِ نفس کے تحفظ کا داعیہ نمایاں تھا۔''
(تکلمات، ص ۵۵)

نگارِ خاطر (فارسی مثنوی)

مثنوی ''نگارِ خاطر'' ڈاکٹر اسلم انصاری کے فارسی ادب کے ساتھ دل سوزی کے رشتے کا ثبوت ہے۔ اسے ناشرانِ خاوران لاہور (پاکستان) نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔ شاعر کی معروضات کے بعد پیش گفتار میں ڈاکٹر آفتاب اصغر کی قیمتی رائے درج ہے جب کہ اس مثنوی کا مقدمہ ڈاکٹر الیاس عشقی کا تحریر کردہ ہے۔ اس مثنوی کو چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ غبارِ شبنم
۲۔ جہانِ معنی
۳۔ نگارستان
۴۔ نگر شہا
۵۔ برگ‌ہائی چند از کتابِ کہنہ و نو
۶۔ تکملہ

مثنوی کے آخر میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''Prefatory'' کے عنوان سے اپنی مثنوی کا جامع انداز میں تعارف بھی کروایا ہے۔ اسلم انصاری اپنی ''معروضات'' میں یوں کہتے ہیں:

درمورد سبکِ شعریِ ''نگارِ خاطر'' شایستۂ تذکری دانم کہ درآن شاعری را بطور خاص نمونہ و سرمشق قرار ندادہ ام۔ البتہ از کسب فیض از سایر اساتید بزرگ فارسی ہیچ وقت ہیچ چیز مزاحم اینجانب بنودہ است۔ ھمینطور پزیرفتن اثراتی قدری شعوری وقدری نیم شعوری نیز برای یک ذہن خلاق عملی است بسیار طبیعی۔ ہٰذا ہرگاہ فرصت ایجاب کردہ است از تقدیم خراج تحسین وتمجید بحضور اساتید ھنر مند دریغ نورزیدہ ام'' (نگارِ خاطر۔ ص ۱۵)

فارسی ادب میں ''ساقی نامہ'' لکھنے کی روایت بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی مثنوی ''نگارِ خاطر'' میں ''بیا ساقی سرت گردم، دگر خیز'' کے عنوان سے ''ساقی نامہ'' شامل ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار درج ہیں:

بیاساقی سرت گردم، دگر خیز بجانِ خاوران شوری بر انگیز
زمانه شد شب اوسر نیامد زبامش آفتاب بر نیامد
اگرچه اندرونش پُر ز را زیست سرشکش بی ازبی گدازیست
اگرچه صد چراغ از غیر اندوخت چراغ جان زمشتاقی نیا فروخت
اگرچه چشمِ تن بیدار دارد مژه برهم زدن هم خواب آرد

ادبیات عالم میں سیرافلاک کی روایت (تنقید و تحقیق)

''ادبیاتِ عالم میں سیرِ افلاک کی روایت'' اسلم انصاری کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں اسلم انصاری کے سولہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے ۲۰۰۶ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے مالی تعاون سے شائع کیا ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ''ادبیات عالم میں سیرِ افلاک کی روایت'' ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس مضمون میں عالمِ ارواح، بہشت و دوزخ یا جہان دیگر

کی روحانی یا خیالی سیر کو موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم لاطینی شاعر ورجل (Virgil) کی منظوم داستان ''Aened'' اطالیہ کے کلاسیکی شاعر دانتے الغیری کی شہرہ آفاق تصنیف ''Devine Comady''، ''ارداویراف نامہ منظوم''، ''قرآن مجید کے معراج اور واقعہ اسریٰ''، ابوالعلا المعری کے ''رسالۃ الغفران'' حکیم سنائی غزنوی کی ''سیر العباد الی المعاد''، فریدالدین عطار کی ''منطق الطیر''، ابن عربی کی ''فتوحاتِ مکیہ'' خواجہ احمد لطیف کی ''اعراف کی ایک روح''، مولانا آزاد کی ''نیرنگِ خیال'' سجاد علی انصاری کے ڈرامے ''روز جزا''، علامہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' اور چودھری افضل حق کی اس موضوع پر شائع ہونے والی کتاب ''زندگی'' کا بھرپور محاکمہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب کے ایک اور مضمون ''الم حیات اور مذاہب عالم'' میں مختلف مذاہب کے تصورات رنج والم کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک مضمون ''ابن رشد اور اس کے افکار'' بھی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے بہ قول یہ مضمون ان کے عہد جنوں کی یادگار ہے۔ اس مضمون میں اسلم انصاری نے ابن رشد کے فلسفے پر اندلس کے علمی پس منظر میں روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اس معروف مسلمان فلسفی کے حالات زندگی، اور ارسطو کے شارح کے حیثیت سے اس کے مقام کا تعین کیا ہے۔ ''غالب و مومن کے عہد کا ادب'' مسلمانوں کے زوال کی وجوہات کی تلاش کا سفر ہے۔ اسلم انصاری کے اس مجموعہ نثر میں ایک مضمون ''علی گڑھ کے اردو ادب پر اثرات'' بھی ہے۔ بظاہر یہ مضمون تدریسی نوعیت کا دکھائی دیتا ہے لیکن مصنف نے اس موضوع میں سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ چند جواہر پارے تلاش کیے ہیں۔ ''حرف و نغمہ اور خاموشی کی مابعد الطبیعات'' میں مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا اسداللہ غالب کے اشعار کی روشنی میں معنویت کی تلاش کی گئی ہے۔ اسی نوع کی ایک کڑی ''اقبال، رینان اور جمال الدین افغانی'' بھی ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے ممتاز مستشرق موسیو رینان، سید جمال الدین افغانی اور علامہ محمد اقبال کے مشترکہ افکار کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے فارسی شعر و ادب کے ایک مغربی مؤرخ اور نقاد پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن پر ایک شاندار مضمون بھی لکھا ہے، مصنف کا خیال

ہے کہ علامہ اقبال نے قرۃ العین طاہرہ کی غزلیں براؤن ہی کی ایک تصنیف میں دیکھی تھیں جن سے متاثر ہوکر اقبال نے ان میں سے ایک غزل ''جاوید نامہ'' میں درج کی تھی۔ بعض روایات میں یہ غزل قرۃ العین طاہرہ کی نہیں بلکہ اس کے اصل شاعر مُلّا طاہر وجیہہ ہیں۔ ''بیسویں صدی میں المیہ طرزِ احساس کی نمود'' میں مغربی فکر کے نمائندہ شخصیات کاؤنٹ کیسرلنگ اور اونامونو کے المیہ طرزِ احساس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ دو حضرات کی سوانح مرتب کی ہے اور ان کے مرکزی موضوعات یا خیالات کی تشریح بھی کی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر اسلم انصاری کی یہ تحریر اپنی نوعیت کی واحد کوشش ہے۔ ایمرسن کالج ملتان (اب گورنمنٹ کالج ملتان بوسن روڈ) اسلم انصاری کی مادر علمی ہے۔ یہیں کے ایک استاد پروفیسر تاج محمد خان نے ان کا فارسی ادب سے لگاؤ پیدا کیا تھا۔ پروفیسر مرحوم نے اورینٹل سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ انہی کی دعوت پر معروف ایرانی ادیب آقای سعید نفیسی کالج میں تشریف لائے۔ اسلم انصاری نے ماضی کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مضمون اس موضوع پر بھی لکھا ہے۔ ایک مضمون ژاں پال سارتر پر بھی ہے۔ آخر میں دو مضامین اسلم انصاری نے اپنے محبوب شعرا فراق گورکھ پوری اور یاس یگانہ چنگیزی پر بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب موضوع کے تنوع کے اعتبار سے رنگوں کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔

چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی'' (تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی تازہ ترین کتب میں ایک ''چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی'' بھی ہے۔ یہ دراصل اس شہرہ آفاق تصنیف کا فکری و فنی مطالعہ ہے۔ مصنف نے اس میں چودھری افضل حق کا سوانحی خاکہ بھی مرتب کیا ہے۔ دو سو اسّی صفحات پر مشتمل یہ تحقیقی مقالہ ۲۰۰۸ء میں دارالکتاب لاہور نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا پیش لفظ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرے بچپن میں ہمارے گھر کا ذخیرۂ کتب جو زیادہ تر والدِ مرحوم کے ذوقِ مطالعہ اور

میرے بہن بھائیوں کے شوق تعلیم و تعلم کا حاصل میرے ذہن و خیال کی پہلی درسگاہ میرے لیے دنیائے تخیل کی طرف کھلنے والا پہلا رنگین اور طلسمی دریچہ تھا۔ میں نے "زندگی" کو سب سے پہلے اس دریچے کی اوٹ میں دیکھا۔" (چوہدری افضل اور ان کی تصنیف "زندگی"۔ ص ۷)

اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں چودھری افضل حق کا سوانحی خاکہ مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم کا عنوان "زندگی ایک تمثیل" ہے۔ اس میں مصنف نے اس تصنیف کو "حبسیہ ادب" کا شاہکار قرار دیا ہے۔ چوھدری افضل حق نے یہ کتاب پسِ دیوار زنداں رہ کر لکھی تھی اس لیے ڈاکٹر اسلم انصاری نے دورانِ قید تخلیق کردہ ادب کے ساتھ اس کا بھرپور موازنہ کیا ہے۔ تمثیل کی تعریف، محرکاتِ تصنیف، موضوع اور واقعاتی موتیف، موتیف یا ساختیاتی تشکیل اور مرکزی کہانی کے اجزائے ترکیبی اور ان کا مابعد الطبیعاتی اسٹرکچر جیسے ذیلی عنوانات کی مدد سے مصنف نے ثابت کیا ہے کہ یہ تصنیف یعنی "زندگی" اپنے طبعی اور مابعدالطبعی دونوں حصوں میں چودھری افضل حق کے عہد کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی ایک مضبوط تمثیل بھی ہے۔ تیسرا باب "عالمِ مثال اور عالمِ برزخ" ہے۔ اس میں برزخ کے تصور کی مختلف حوالوں سے توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ مصنف نے چودھری افضل حق کی "ایک خادمِ خلق کی کہانی"، "معلم کی کہانی"، "ایک ہندو لڑکی کی کہانی"، "مراثن کی ایک عورت کی کہانی" اور "ایک پنجابی زمیندار کی کہانی" جیسی تخلیقات کو عالمِ مثال کی پاک روحوں کی کہانیوں میں شمار کیا ہے۔ جب کہ عالمِ مثال کی ناپاک روحوں کی افسوس ناک کہانیوں کے ضمن میں "صفائی سے بے پرواعورت کی کہانی"، "بچوں کی تعلیم سے غافل باپ کی کہانی"، "بے کار امیر کی کہانی"، "غریبوں کو ستانے والے شخص کی کہانی"، "چور اور سینہ زور کی کہانی"، "بیوی بچوں سے بدسلوکی کرنے والے شخص کی کہانی"، "خوشامد پسند کوتوال کی کہانی"، "ایک حاسد کی کہانی" اور "ایک کینہ پرورعورت کی کہانی" کو درج

یا ہے۔ان کہانیوں کے واقعاتی اور معاشرتی مواد کا مصنف نے بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔''زندگی'' کے واقعاتی مواد کو ذاتی اور ہم عصر زندگی اخذ شدہ بیان کیا ہے۔''زندگی'' کے فکری جائزے کے دوران مصنف نے اس شہرہ آفاق کتاب میں سے سائنسی ایجادات اور پہلی جنگ عظیم کے واقعات وغیرہ کا سراغ بھی لگایا ہے۔انہوں نے افضل حق کے تاریخی شعور کو تمثیلی معنویت کی ایک نئی جہت قرار دیا ہے۔

باب چہارم میں ''زندگی'' کے فلسفہ مذہب اور فلسفہ اخلاق کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے خیال میں ''زندگی'' کے مصنف کا نقطہ نظر ''اخلاقی جس کے دبستان'' کے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے۔اس لیے کہ ''زندگی'' کے مرکزی کردار کے علاوہ بعض دوسرے کردار بھی اخلاقی جس کے تابع ہو کر خیر وفلاح کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بابِ پنجم میں ''زندگی'' کا فنی اور تکنیکی مطالعہ کیا گیا ہے۔چودھری افضل حق کے تصورات ونظریات سے کسی حد تک مصنف کے متاثر ہونے کے باوجود اس کہانی کے فنی نقائص کا بڑے واشگاف انداز میں تذکرہ ملتا ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

''کہانی میں عالمِ مثال کی واردات کہانی کے ہیرو کے خواب سے شروع ہوتی ہے اور خواب کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔لیکن جب خواب کا اختتام ہوتا ہے تو آنکھ کھولنے والا کہانی کا ہیرو نہیں بلکہ کتاب کا مصنف ہے جو اپنے آپ کو گورکھپور جیل میں پاتا ہے۔''

(چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف 'زندگی'۔ص ۲۰۶)

باب ششم میں ''زندگی'' کا اسلوبیاتی مطالعہ اور بابِ ہفتم میں اس کا ادبیات عالم کے تناظر میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری کا یہ تحقیقی وتنقیدی کام ایک ایسی کتاب پر ہے جسے انفرادی مقام حاصل ہونے کے باوجود نہ تو فکر کی تاریخ میں اہمیت ملی اور نہ ہی ادب کی تاریخ میں جائز مقام مل سکا۔اس لحاظ سے ڈاکٹر اسلم انصاری نے وقت کے دھندلکوں میں گم ہوتی ہوئی ایک کتاب کو ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا ہے۔یہی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔

اردو شاعری میں المیہ تصورات (تنقید و تحقیق)

اردو شاعری میں المیہ تصورات (میر سے فانی تک) ڈاکٹر اسلم انصاری کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی طرف سے انہیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ایوارڈ ہوئی۔ یہ کتاب حال ہی میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اس کتاب کی ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب میرے برسوں کے ذہنی سفر کا حاصل ہے۔ اس میں پیش کیے گئے تنقیدی تجزیے طویل تاملات کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے دوران ماہ وسال کی کتنی ہی گردشیں دبے پاؤں نکل گئیں اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی'' (اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ص ۲۴)

مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں اس موضوع سے اپنے جذبات کے اظہار کی روداد قلم بند کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اردو کے عظیم کلاسیکی شعراء کی شاعری کے المیہ تصورات کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ''فلسفۂ غم'' کو انہوں نے تمام شعرا پر ایک ہی انداز میں منطبق نہیں کیا بلکہ ہر شاعر کے اپنے شعری وجود میں سے غم کے عناصر کو تشکیلی روپ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اگر ابواب کے عنوانات ہی دیکھ لیے جائیں تو ذیلی جزئیات سے کسی حد تک آگاہی ہو جاتی ہے:

شعر وادب میں المیہ تصورات کی معنویت

میر تقی میر: اردو کا عظیم ترین الم نگار شاعر (غم عشق، غم حیات اور غم کائنات)

مرزا محمد رفیع سودا: غم حیات اور غم [illegible]

خواجہ میر درد: دوران کا وجودیاتی اور مابعد [illegible]

قائم چاندپوری کی حزینہ تشکیلات اور میر اثر کی فراقیہ شاعری

دبستان لکھنؤ اور الم پسندی کی شعری روایت: مصحفی، جرأت، ناسخ اور آتش

۷۔ دبستانِ لکھنؤ کی مثنویوں میں الم نگاری کے چند اسلوب (سحر البیان، گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق)

۸۔ نظیر اکبرآبادی: نشاط پسند الم نگار شاعر۔ غمِ حیات اور غمِ روزگار کا وسیع تر شعور

۹۔ اردو مرثیہ اور میر انیس کی الم نگاری

۱۰۔ مومن، ظفر اور ذوق۔ مضمون آفرینی، بیانِ غم اور المیہ تشکیلات

۱۱۔ مرزا غالب اور ان کا فلسفۂ الم وجود و غمِ حیات

۱۲۔ مولانا حالی۔ غم کا اجتماعی تصور (یادِ ماضی، قوم اور انسانیت کا غم)

۱۳۔ علامہ اقبال کی شاعری کے المیہ عناصر کے فکری اور جذباتی پہلو (آہِ سرد، احساسِ تنہائی و افسردگی، یادِ ماضی، قوم کا غم، خونِ جگر اور غمِ دیگر)

۱۴۔ فانی بدایوانی: وجودِ دردِ مسلّم، علاج نامعلوم (یاس و الم کی مابعد الطبیعات)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس تصنیف میں اردو شاعری کے ایک طویل دور کو غم کی نیلگوں عینک لگا کر دیکھا ہے۔ یہ ایک اہم فکری اور جذباتی روش کے فکری و فنی تجزیے سے عبارت ہے۔ اردو کے اہم ترین شعرا کے المیہ افکار و احساسات کے معنی متعین کرنے کی یہ کوشش اس لیے بھی لائق ستایش ہے کہ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس میں شعراء کے مطالعے کو ان کی انفرادی تحلیلِ نفسی کے روپ میں نہیں ڈھلنے دیا۔ بلکہ نفسیاتی علوم کے موجودہ شعور کے تناظر میں ان کے مقام کا تعین کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری ایک وسیع المطالعہ شخصیت ہیں اس لیے ان کی حدِ تحقیق و تنقید میں فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات کے علاوہ تاریخ ادب کے جدید انکشافات [illegible]

ڈاکٹر اسلم انصاری کی غزل

ہم اکثر یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کسی سخن ور کی ایک خوبی دوسری خوبیوں تلے دب جاتی ہے۔ یا کسی ایک پہلو پر اس قدر دادو تحسین مل جاتی ہے کہ باقی پہلو چنداں اہمیت کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ایک شاعر، ادیب، نقاد، مترجم، اقبال شناس، اور کالم نگار کی حیثیت سے اپنی زندگی کو کئی سطحوں پر گزارنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ان کی تخلیقیت ہر سطح پر اپنی پہچان رکھتی ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلم انصاری نے اپنی غزل میں انسانی نفسیات کے کئی ایسے تاروں کو چھو دیا ہے کہ یہ صنف کئی دہائیوں کے لیے پھر سے ''محبوبہ سخن وراں'' ہوگئی ہے۔ غزل کے ساتھ برتے جانے والے تعصب نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ اسے ''مختلف الموضوع'' اشعار کی وجہ سے ''نیم وحشی'' کہا گیا۔ بے تکلف اس کی گردن ''مار دینے'' کے چرچے ہوئے لیکن پھر بھی ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا غزل گو پیدا ہوا کہ جس کے طفیل اس کی بقا کا سامان ہوا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اردو غزل کے اس لہجے کی نئے سرے سے بازیافت کی ہے جو فراق گورکھپوری سے ہوتا ہوا میر تقی میر تک پہنچتا ہے۔ ان کی غزل کے پس منظر میں ایک مسلسل سوچ اور ذہن وشعور کی کئی سطحیں کارفرما دکھائی دیتی ہیں ڈاکٹر اسلم انصاری اپنے ذاتی تجربے کو بار بار غزل کی روایت سے ٹکرا کر دیکھتے ہیں۔ ان کی فکری کائنات جدید موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کا قاری جب تک شعور کی منزلوں سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو ان کے اشعار کی اصل روح تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ بیسویں صدی کے غزل گو شعرا کی اگر کوئی فہرست ترتیب دی جائے تو پہلے بیس ناموں میں اسلم انصاری کو کہیں نہ کہیں جگہ دینا پڑے

گی۔انہوں نے ایسے نادر موضوعات کو فلسفیانہ اسلوب کی تہ چڑھا کر پیش کیا ہے کہ وہ زندگی اور اس سے متعلقہ امور کا سیدھا سادھا اظہاریہ بن گئے ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری کے فن پر بحث کرتے ہوئے حفیظ الرحمٰن خان کہتے ہیں:

''ایک خوش فکر شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ ادب وفن کے مخصوص حلقوں کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔وہ تنقید کے مروج پیمانوں کا محتاج بھی نہیں ہوتا جو رائج کلیوں کی روشنی میں مقرر کیے جاتے ہیں۔وہ اپنی پہچان دبستانوں کے حوالے سے نہیں کراتا بلکہ اپنے ہمہ گیرادراک اور منفرد طرزِ احساس سے اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔علاوہ ازیں وہ اپنے عہد کے جذبوں اور فکری رویوں کو شعر میں ہنرمندی کے ساتھ سمو دیتا ہے۔اس اعتبار سے اسلم انصاری عہد کا نمائندہ شاعر ہے'' (خیال و نظر. ص ۱۷۲)

ڈاکٹر اسلم انصاری بہ طور تخلیق کار بہت سی جہتوں کے حامل ہیں لیکن غزل ان کی پہلی محبت ہے اور وہ اس محبت کو کسی صورت بھولنا نہیں چاہتے۔غزل سے اپنے جذباتی انسلاک کا اظہار کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں:

''میری شاعری کا ابتدائی دور زیادہ تر غزل سے عبارت رہا ہے اور اس میں شک نہیں کہ غزل کے فن سے مجھے ایک گونہ طبعی مناسبت رہی ہے۔ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے شعوری کوشش کی ہے کہ غزل کی فنی روایت کا پورا پورا فہم حاصل کروں۔میر، مصحفی، آتش، غالب، مومن اور اقبال غزل کی روایت کے سب سے بڑے نام ہیں۔ جن کی غزل کا بالاستعیاب مطالعہ کیے بغیر کوئی بھی غزل کی جمالیات کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔میں نے سعی کی ہے کہ غزل کو ایسی جمالیاتی اساس فراہم کی جائے جسے مجموعی طور پر اس عہد کی تغزل کا نام دیا جا سکے۔میں نے احیائی میلانات یا لسانی انحرافات سے کہیں زیادہ تخلیقی تجربے کے فطری نشو و ارتقا اور شعری مطالب کے جمالیاتی ابلاغ کو اہمیت دی ہے۔میں ہمیشہ موضوع اور ہیئت کی نامیاتی وحدت کا قائل رہا ہوں۔اسی لیے میں پہلے

سے طے شدہ یا خارج سے عاید کیے ہوئے لسانی فریم ورک کو شعری تخلیق کے عمل میں چنداں لائق اعتنا خیال نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر سچا تجربہ اپنا لسانی سیاق و سباق اپنے ساتھ لاتا ہے۔" (خواب و آگہی، ص۱۶)

اسلم انصاری نے غزل کی صنف کو شاید ساٹھ کی دہائی میں بطور شاعر قبول کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر طرف نظم گوئی کا شہرہ تھا۔ مختلف ادبی تحریکوں نے غزل کو ایک "راندۂ درگاہ" صنف بنا دیا تھا۔ اسلم انصاری نے چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کی بجائے وقتی دھندلکوں کو قبول کیا اور یہی دھند لکے بعد ازاں ایک نئے اجالے کی آمد کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اسلم انصاری نے یقیناً غزل کے عروج کے آمدہ زمانے کو اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔ غلام حسین ساجد کے مطابق:

"اسلم انصاری نے جب شعر گوئی اختیار کی تو اس وقت نظم نگاری کا سیلاب اپنے زوروں پر تھا۔ لسانی تشکیلات کی تحریک سے وابستہ شاعروں نے وہ ہڑبونگ مچا رکھی تھی کہ "تنگنائے غزل" کے کنارے ڈھیتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں اسلم انصاری جیسے نوجوان اور نو وارد شاعر کا اپنے شعری اثاثے کی حرمت کی حفاظت کرنا اور اسے لسانی بے راہ روی اور فکری انتشار سے بچائے رکھنا بذاتِ خود ایک معجزہ دکھائی دیتا ہے۔" (ماخذ ص۲۵)

یہی وجہ ہے کہ اردو غزل کے شعرا کی میراتھن دوڑ میں اسلم انصاری ایک ذہین اور بالغ شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جدیدیت کی کسی وقتی تحریک سے مرعوب نہیں ہوئے۔ سپاٹ اور بے جان روایت بھی انہیں متاثر نہ کر پائی بلکہ ان کی غزل کا اپنا ایک واضح میلان رہا۔ ان کی غزل، فارسی شاعری کی قدیم روایت سے جڑی ہونے کے باوجود جدید رجحانات کی علم بردار ہے اور اسی توازن نے انہیں قدیم و جدید کا سنگم بنا دیا ہے۔ اسلم انصاری کے ہاں غزل کے نئے طرزِ احساس کے ساتھ زندگی کے مہذب اور سلجھے ہوئے انداز کا رچاؤ بھی بہتات کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اسی الگ تشخص کی بدولت ان کے ہاں "راہ و منزل" کا شعور آغاز شاعری کے زمانے سے ہی موجود تھا۔ انہوں نے انسان کے جذباتی میلانات کی قدرے غیر جذباتی انداز

میں منظر کشی بھی کی ہے۔تغزل اور روانی کی فراوانی کے سبب ان کی ایک غزل کو (جو گلوکار غلام عباس نے گائی) ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ایک خاص سطح کے قاری کے لیے آج بھی یہ غزل اسلم انصاری کی پہچان ہے:

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا، جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

اسلم انصاری کی غزل کا ایک اہم موضوع تنہائی ہے۔ جابر علی سید کے خیال میں ''ان کا احساسِ تنہائی شدید تر ہے'' (اسنعاہے کے جار شہر. ص۹٦)

اسلم انصاری کے ہاں تنہائی ایک عالمگیر موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ بیسویں صدی کے مفکروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نزدیک تنہائی کا احساس ایک خطرناک داخلی بیماری تھا۔ شاید اس کی وجہ صنعتی تمدن کا پھیلاؤ اور عالمی جنگوں کے بعد کی انسانی بے وقعتی تھی۔ آج کا فرد چوں کہ بین الاقوامی برادری کا رکن ہے اس لیے مخصوص تہذیبی، جغرافیائی اور لسانی دائرے اس کے لیے محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں۔ انفرادی رشتوں کا یہی احساس انسان کو عدمیت و نیستی کے تصور سے آشنا کرنے کا کام دے رہا ہے۔ اسلم انصاری کا ''احساسِ تنہائی'' تیسری دنیا کے مسائل و معاملات سے لے کر خود ان کے داخلی کرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اس احساس کی تمام اقسام مثلاً تنہائی (Loneliness)، علیحدگی (Isolation)، اکیلا پن (Aloneness)، خلوت (Solitude)، اور بیگانگی (Alienation) کے کئی رنگ اسلم انصاری کی غزل کو معاصر غزل سے منفرد اور باثروت بناتے ہیں۔ان رنگوں کی چند مثالیں دیکھیں:

جو دیکھیے تو سبھی کارواں میں شامل ہیں
جو سوچیے تو سفر میں ہر ایک تنہا ہے

☆☆☆☆

ہر شخص اس ہجوم میں تنہا دکھائی دے
دنیا بھی اک عجیب تماشا دکھائی دے

☆☆☆☆

اس نگری میں ہر چہرے پر
تنہائی کی گرد جمی ہے

☆☆☆☆

کوئی صدا نہیں اتری کسی دریچے سے
درِ خیال سے اب کوئی جھانکتا بھی نہیں
یہ ایک چاپ جو مدت سے سن رہا ہوں میں
کوئی تو ہے جو یہاں آکے لوٹ جاتا ہے

☆☆☆☆

دل پھر دل ہے غم پھر غم ہے
رولینے سے کیا ہوتا ہے

☆☆☆☆

شامِ وحشت، شبِ ہجراں کا بھی کچھ پاس رہے
سارے آنسو اسی لمحے کو نہ بخشے جائیں

☆☆☆☆

ایک جدید حسیت کے نمائندہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر اسلم انصاری کی غزل میں

معنوی تہ داری کے ساتھ معنویت کی حدود کا تعین شاعری کے بنیادی ضوابط کے عین مطابق کیا گیا ہے۔ان کا لہجہ عامیانہ تو ہرگز نہیں لیکن اتنا اجنبی بھی نہیں کہ آوازوں کے اس انبوہ میں اپنی علیحدہ شناخت ہی ترتیب نہ دے سکے۔ان کے ہاں ''نیا انسان'' عہدِ حاضر کے جدید طرزِ احساس کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور جذبے اور فکر کے نئے نئے راستے تلاش کرتا جاتا ہے۔یہ بھی راستے ایک ایسے شہر کی طرف جاتے ہیں جو ایک خواب ناک فضا میں اپنی تمام تر پراسراریت کے ساتھ موجود ہے۔آ گہی کے عذاب سے آشنا ہونے کے باوجود خوابوں کی فسوں کاری کے تجربات ان کے ہاں ایک نامیاتی کل بن جاتے ہیں۔شاید یہ **Night Journey** کی ایک ایسی صورت ہے جہاں دھند اور خواب کے طلسمی ماحول میں تخلیقیت جنم لیتی ہے۔ان اشعار میں کئی ذائقے ایسے ہیں جو بے کرانی کے مزے دیتے ہیں:

سحر، طلسمِ ہوائے طرب جگائے کیا
کہ شب وہ سحرِ گراں ہے کہ ٹوٹتا بھی نہیں

آئینۂ عالم میں یہ عنوانِ بہاراں
کس شوخ کی ایک ایک ادا ٹھیر گئی ہے

☆☆☆☆

میں تشنہ کام سہی، پھر بھی تیرا ساحل ہوں
تو خود میں ڈوبا ہوا ہے کہ میرا دریا ہے

☆☆☆☆

عدم کی سمت سے سوئے وجود آتا ہوا
نیا جہاں ہو کوئی چشمِ دوربیں کے لیے

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسلم انصاری کی غزل کے خواب گوں لہجے پر تبصرہ کرتے ہوئے مبین مرزا کہتے ہیں:

''غزل کے فن میں جدیدیت کے پیروکاروں پر یہ الزام ہے کہ ان کا سفر ابہام کی زد میں ہے اور ان کا اظہار حسنِ ابلاغ سے بے بہرہ ہے۔ اسلم انصاری جدید شعرا کی فہرست میں شامل ہونے کے باوجود اس سقم سے مبرّا ہے۔''

(اسلم انصاری کا شعری تناظر، ص۱۷۶)

بلاشبہ غزل کے دونوں مصرعوں کے مابین ایک حد فاصل کا ہونا ضروری ہے، شعر کی تفہیم کے لیے قاری کو بھی تھوڑا سا سفر کرنا چاہیے، کیونکہ آخرکار وہ تخلیق کی اس مثلث کا تیسرا زاویہ ہے لیکن قاری کی علمی استعداد کی آزمائش کرنا شاید زیادتی ہے۔ابہام اگرچہ شعر کا حسن ہے لیکن معنویت کے کلی فقدان کی وجہ سے شعر شعر نہیں رہتا بلکہ ایک معمہ بن جاتا ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے بعض اشعار میں ایسے مضامین باندھے ہیں جو بڑے عام اور روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں لیکن مخصوص لہجے کی مکمل گرفت ان اشعار کو آفاقی مقام پر پہنچا دیا ہے۔اسلم انصاری کی غزل کے اس نوع کے اشعار میں ایک خواب ناک کیفیت ہے، یوں لگتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی سفر اسی شام وسحر کے مدھم پن میں طے ہو رہا ہے:

وہ ملا تھا سرِراہے، پہ بہت لوگ تھے ساتھ
آج کی شام تو وہ شخص اکیلا ہوتا

☆☆☆☆

عجب نہیں کہ ترے پاس پھر نہ آئیں ہم
بہت رہے گی ترے لطفِ مختصر کی یاد

☆☆☆☆

کوئے بربادی سے آگے دھیان کے سو موڑ ہیں
ہم بھی کہتے تھے کہ لوٹیں گے تو گھر جائیں گے ہم

☆☆☆☆

دفعتہً ہم جھیل کی جانب نہ مڑ جاتے اگر
مقبروں تک تو وہی رستہ ہمارے ساتھ تھا

☆☆☆☆

اک موڑ مڑے ہی تھے کہ آگے
ہجرت کا طویل راستہ تھا

☆☆☆☆

تخلیقی عمل کے دوران کوئی شاعر بھلے کسی بھی شعری صنف کو اظہار کا وسیلہ بنائے۔ اس کے عہد کا آشوب منقلب ہوکر اس میں ضرور شامل ہوجاتا ہے۔ نظم میں اس کے نقوش واضح اور ٹھوس حالت میں ہوتے ہیں جب کہ غزل میں اس کے خاص مزاج کی وجہ سے یہی موضوعات پس منظر میں رہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ غزل میں ان مسائل کو اگر سیدھے سادھے انداز میں بیان کر دیا جائے تو غزل، غزل نہیں رہتی اخبار بن جاتی ہے۔ تجریدیت اور ماورائیت کی مخصوص فضا کی موجودگی میں بات کرنا بعض اوقات ''پیش پا افتادہ'' تصورات سے بچالیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے غزل میں ایک ایسا لہجہ متعارف کرایا ہے جو بڑے لامحسوس طریقے سے معاشرے میں پھیلے سیاسی معاشرتی اور معاشی جبر کو بے نقاب کرتا ہے، فرق یہ ہے کہ انہوں نے دیگر غزل گو شعرا کے برخلاف اس موضوع کو غزل کے پیش کردہ علامتی اور ماورائی انداز میں تخلیق کا جزو بنایا ہے۔ اس دوران کہیں پر بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ شعر کسی واقعے یا خبر سے ماخوذ ہے:

کوئی آواز تو ہوتی غمِ دوراں پہ محیط
کوئی فریاد تو دنیا میں رسا چاہیے تھی

☆☆☆☆

عجب نہیں کہ نظامِ جہاں بدل جائے
خیال و حرف کے رشتے بدلتے جاتے ہیں

ایک بچی جو (تصویر میں) سوکھے ٹکڑوں کی کاوش میں ہے
کوئی بڑھ کر اٹھا لے اسے گود میں۔ کوئی ایسا نہیں

☆☆☆☆

المیہ تو یہی ہے کہ تماشا نہ ہوا
ورنہ کردار تو سب آئے تھے یکتا بن کر

☆☆☆☆

بے چہرگی کی دھند میں اوراکِ صورت کیا کریں
گرداب سا شکلوں کا ہے، آشوب سا لہجوں کا ہے

☆☆☆☆

وہ نہ آیا تھا، تو کیا کیا اختلاف رائے تھا
اس کو دیکھا ہے تو سارے ہم نوا کیسے ہوئے

☆☆☆☆

کہا جاتا ہے کہ عشق انسان کو ''اصحابِ کہف'' کے غار میں سلا دیتا ہے۔ یہ عشق ومحبت کا گداز جذبہ ہی ہے جس کی بدولت زندگی کی رونقیں قائم ہیں۔ عشق کے احساس کے بغیر انسانی دل برف کی قاش کے مانند ہے جس میں جذبہ نہیں بلکہ کافور کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لفظ ''حب'' کا ''عشق'' متبادل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلم انصاری کی غزل میں عشق کی وارفتگی سے زیادہ حب کی احتیاط دکھائی دیتی ہے۔ ان کے گہرے جمالیاتی ذوق نے انہیں اس علاقے کی سیر کرائی ہے جہاں وصل اپنی وضع داری اور میر کے سے ادب کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں اسلم کے اشعار جو تمثال بناتے ہیں ان میں تشدد آمیز رویہ نہیں بلکہ نرماہٹ محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق کے مطابق:

''اسلم نے عشقیہ واردات کو بڑی نرمی اور دل آویزی کے ساتھ جدید غزل کی روایت کا

جزو بنایا ہے۔ اسلم انصاری کا شاعرانہ طرزِ احساس لطافتوں کا حامل ہے۔" (اردو غزل کے نئے زاویے۔ ص ۱۸)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی غزل میں "وصل" کے چند خوب صورت لمحوں کی تصویریں دیکھیے:

اتنی سہانی شام تھی لیکن
تو چپ چاپ خفا بیٹھا تھا

☆☆☆☆

خفا نہ ہو جو ترے ہاتھ چھو لیے میں نے
کہ یہ مقام تو ویسے بھی درگزر کا ہے

☆☆☆☆

یوں ٹھہر جاتی ہے اس نغمہ سخن کی آواز
جیسے پل بھر کو لرزتا ہوا شعلہ ٹھہرے
خفا نہ ہو کہ ترا حسن ہی کچھ ایسا تھا
میں تجھ سے پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

☆☆☆☆

دل یہ کہتا ہے تجھی سے ملیے۔
میں یہ کہتا ہوں کہ پھر کیا ہوگا

☆☆☆☆

اور اب یہاں "ہجر" کے چند مناظر کے عکس پیش ہیں:

تجھ سے آنکھ ملاتا کیسے
تو اس دن جانے والا تھا

☆☆☆☆

کچھ تو احوالِ غمِ دل بھی سنایا ہوتا
رک گیا تھا تو اسے اور بھی روکا ہوتا

☆☆☆☆

تو نے جب ہاتھ چھڑایا تھا، وہ پل
تجھ کو بھی یاد تو آتا ہوگا

☆☆☆☆

ٹھہر کے سن تو سہی غم کی ڈوبتی آواز
پلٹ کے دیکھ تو لے منظرِ شکستِ وفا

☆☆☆☆

بچھڑتے وقت بہت اعتماد تھا اس میں
اسی خیال سے ہم نے بھی پھر نہ دی آواز

☆☆☆☆

اب ملے ہیں تو بچھڑنا بھی یقینی جانو
ایسا ہونا ہے کسی دن مری جاں ہونا ہے

☆☆☆☆

اس کا مقصود تھا ہر حال بچھڑنا ہم سے
ہم کو منظور تھی ہر رنگ میں راحت اس کی

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسلم انصاری کے دونوں شعری مجموعوں ''خواب و آگہی'' اور ''نقشِ عہدِ وصال کا'' میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ ان غزلوں میں غم کی ایک ہلکی سی لکیر تو تیرتی دکھائی دیتی ہے لیکن ان غزلوں کا سب سے اہم اور منفرد موضوع زندگی، کائنات اور وقت کے تسلسل کے حوالے

سے اٹھائے گئے شاعر کے وہ سوالات ہیں جن میں وہ کائنات کی ابدی حقیقتوں کی تلاش کے سفر میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔اس سلسلے میں اس کا یہ دعویٰ بھی ہر لحاظ سے بجا لگتا ہے:

ایک دنیا ہے مرے ذوقِ سخن کے روبرو
ایک عالم ہے مرے حرفِ رسا کی راہ میں

یہ وہ سوالات ہیں جن کا تسلی بخش جواب آج تک کسی انسان کو نہیں مل سکا اور شاید کبھی مل بھی نہ سکے۔ یہ سوالات اور معمے بہ ذاتِ خود آگہی کی جستجو کے حوالے سے ایک جہانِ معنی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلم انصاری کی غزل میں یہ مفکرانہ انداز اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ کائنات کے بصری مغالطوں سے ہٹ کر اس کے اصل حقائق کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں:

آئینہ خانۂ عالم میں کھڑا سوچتا ہوں
میں نہ ہوتا تو یہاں کون سا چہرہ ہوتا

☆☆☆☆

خلا میں یوں تو کہیں بھی بلند و پست نہیں
مگر زمیں کے لیے آسماں بنائے گئے

☆☆☆☆

جنوں کی اوٹ سے دیکھیں تو ساری دنیا میں
بس اک وجود ہے اور صرف ایک چہرہ ہے

☆☆☆☆

کیا ورائے آگہی ہے کچھ خیال
کیا پسِ صحرا بھی ہے صحرا کوئی

☆☆☆☆

کوئی مرقعِ ہستی پڑھے تو اس پہ کھلے
کہ نقش کتنے یہاں رائیگاں بنائے گئے

☆☆☆☆

آفاق اگر دشتِ تفکر ہے تو اس میں
ہر فرد کسی سوچتے لمحے کی طرح ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسلم انصاری کے ہاں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے بڑی مہارت اور وضع داری کے ساتھ عشقیہ، فلسفیانہ اور حتیٰ کہ سائنسی موضوعات کو بھی غزل میں برتنے کی تگ و دو کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے غزل ہی ان کی آخری منزل ہے کیوں کہ غزل میں کوئی آخری منزل ہوتی ہی نہیں۔ یہی اوصاف ہیں جو اسلم انصاری کو ان کے معاصرین سے منفرد بھی کرتے ہیں اور ممتاز بھی۔!!

ڈاکٹر اسلم انصاری کی نظم

اسلم انصاری کی اردو نظم اپنی معرّب اور مفرّس تراکیب، خوب مشابہتوں، استعاروں، اور فلسفیانہ اندازِ تکلم کی وجہ سے بلند کوش، مرعوب کن اور ایک دم مانوس لگتی ہے۔ اس صنف میں اگرچہ ہمہ وقت توسیع کے امکانات موجود ہیں لیکن اسلم انصاری نے اسے جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہاں اسکے اعتبار میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ ان کی نظمیں اپنی فلسفیانہ آب و تاب کی وجہ سے ایک استعاراتی اور صوفیانہ تناظر رکھنے کی وجہ سے نہ تو بہت گنجلک اور پیچیدہ ہیں اور نہ بہت عام فہم اور سادہ۔ ان کے تجربات و مشاہدات کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اسے دانش ورانہ الم ناکی کی ایک صورت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلم انصاری کے پس کربیہ میں زمانی بعد کے ساتھ گم ہو جانے کا کرب نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رومانوی اور روحانی کرب و اندوہ اور اضمحلال کی تہہ میں ہی متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفیانہ تشکیک اور کرید کا یہ انداز محض واقعاتی نہیں بلکہ تہذیبی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ یوں تو اسلم انصاری کو میراجی، ن۔م۔راشد، مجید امجد اور اخترالایمان کے سلسلے کا نظم گو کہنا چاہیے لیکن ان کے ہاں دوسری سمت سے بیدل اور اقبال کی فکری کائنات بھی اپنے اثرات دکھاتی نظر آتی ہے۔ وہ خود اپنی نظموں کے بارے میں کہتے ہیں:

''جہاں تک میری نظموں کا تعلق ہے میں انہیں اپنی غزل کا تکملہ یا منظوم حاشیہ نہیں سمجھتا۔ نظم کے فنی تقاضے غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ مشرق و مغرب کی تفریق سے قطع نظر، نظم عصرِ حاضر کا سب سے بڑا شعری صیغہ اظہار ہے۔ ہمارے ہاں عصرِ حاضر کی تخلیقی واردات اور ابلاغ کے نئے تصورات نے اردو نظم کو جو پھیلاؤ اور تنوع عطا کیا ہے، تجربے

کی شدت، گہرائی اور پیچیدگی کو جس طرح نئی نظم کے مزاج کا حصہ بنایا ہے۔اس نے نظم کی اصناف کو زندگی اور فکر و وجدان کی لامتناہی وسعتوں سے روشناس کر دیا ہے۔''

(خواب و آگہی۔ ص ۱۶)

جدید طرزِ احساس سے آشنا ان نظموں میں روایت کی شمولیت سے ایک متوازن قسم کی فکری و فنی ایکتا کا تصور ابھرتا ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے چوں کہ مغربی اور مشرقی علوم کا بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا ہے اس لیے ان کے ہاں دیگر جدید نظم گو شعرا کی نسبت ''الوہی انا'' واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔سٹیفن سپنڈر نے کہا تھا کہ جدید شاعر کی حساسیت اس حد تک محدود و مجروح ہوتی ہے کہ وہ کبھی Purgatorio کا تخلیق کار دانتے یا Paradise Lost کا خالق ملٹن نہیں بن سکتا، سٹیفن سپنڈر نے شاید اقبال کا فلسفۂ خودی نہیں پڑھا تھا ورنہ وہ اپنی رائے میں ترمیم و تخفیف کے قابل ہو جاتا۔خود اسلم انصاری کے ہاں ایسے کئی موضوعات ابھرتے ہیں جو انہیں اقبال کے وسیلے سے ''الوہی انا'' کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں اسلم انصاری کے نظم ''مرے عزیزو! تمام دکھ ہے'' کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ نظم میرا جی کی ''سمندر کا بلاوا''، ن۔م۔راشد کی ''حسن کوزہ گر'' اور مجید امجد کی ''کنواں'' کی طرح اسلم انصاری کی نمائندہ نظم ہے۔اردو کی پرانی نظم میں اساطیر اور روایتی کہانیوں کے واقعات و کردار کو اکثر تمثیلی انداز میں پیش کیا جاتا تھا لیکن اس کی قدر و قیمت زیادہ تر جمالیاتی بنیادوں پر استوار ہوتی تھی یا پھر ان میں عقیدتی رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی مقدس و محترم ہستی کو نظم یا کہانی کا بنیادی کردار ہی نہیں بنایا گیا۔ جب کہ مغرب میں علامتیت کے زیرِ اثر ڈی ایچ لارنس کی The Escaped Cock جیسی کہانی تخلیق ہوئی۔اسلم نے زیرِ بحث نظم میں لارنس کی طرح رومی اساطیر کے اہم کرداروں آئسس، اوسیرس اور اورس کے برعکس مشرق کی ایک اہم شخصیت سدھارتھ (مہاتما بدھ) کے آخری وعظ کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظم بدھا کے کسی خطاب کا منظوم ترجمہ تو نہیں البتہ اس کے فلسفۂ غم کی عکاسی ضرور کرتی ہے۔ بدھا نے کہا تھا:

"It is true that everything in this life is transitory and filled with uncertainity, but it is lamentable that anyone should ignore this fact and keep on trying to seek enjoyment and satisfaction of his desires. (The teaching of Buddha-p196)

نظم کے آغاز میں اسلم انصاری کہتے ہیں:

مرے عزیزو،

مجھے محبت سے تکنے والو،

مجھے عقیدت سے سننے والو،

مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو،

مرے الم آفریں تکلم سے انبساطِ تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو،

یہاں شاعر کے مخاطب بھی عام لوگ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں کے بعد سکھ کو تج کے حیات کے الم آفریں تکلم سے من کی بستیوں کو بسانا چاہتے ہیں، یہاں بدھا کے بھیس میں شاید اسلم انصاری خود محوِ کلام ہیں جو گوتم کے ابد گیر لہجے میں حیات و ممات کے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ نظم کے آخر میں شاعر کا لہجہ نہایت پر اعتماد ہو جاتا ہے:

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے

کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے

یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے

سکوت دکھ ہے کہ اس کے کربِ عظیم کو کون سہہ سکا ہے

کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے

یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے

مرے عزیزو، تمام دکھ ہے!

اسلم انصاری کی نظم میں حمد و نعت اور مناجات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حمد یہ اور نعتیہ نظموں میں عقیدت کا رنگ تو موجود ہی ہے لیکن ان کا انداز محض ستائشی نہیں بلکہ ان کے ہاں مضبوط دلائل اور منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔ فنی حوالوں سے بھی یہ ذکرِ حبیب ﷺ کی چند خوبصورت مثالیں ہیں، اس نظم میں دیکھیے کس طرح غارِ حرا کے پس منظر میں عظمتِ سرکار دو عالم ﷺ کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

اے شبستانِ حرا

اے لبِ ہستی کی دعا

اے دلِ آدم و عالم کی تمنا کے مثیل

اے گزرتی ہوئی آنات میں اک قائم و دائم کی دلیل

تو وہ خوش بخت کہ اس مہرِ جہاں تاب نے بخشا تجھے جلووں کا ہجوم

حسنِ انفاس کا تنزیہہ و تعطر، تری محراب کو فردوس نما کرتا تھا

تیرے دامن میں ہوا صبحِ رسالت کا طلوع

اے دلِ آدم و عالم کی دعا

اے شبستانِ حرا!

اے شبستانِ حرا!

اسلم انصاری کے نزدیک محبت ایک دائمی جذبہ ہے۔ ایک جگہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

''عنفوانِ شباب میں میرے لیے بھی محبت، صداقت اور حسن ایک ہی حقیقت کے مختلف نام تھے۔ اس لیے کہ تب اور آج بھی میرے نزدیک عقلی صداقتوں تک

رسائی، حسن تک رسائی اور حسن تک رسائی عقلی صداقتوں تک رسائی کے مترادف ہے۔''

(تکلمات۔ ص۲۵)

محبت، صداقت اور حسن کی یہی مثلث ہے جس کے تینوں پہلو اسلم کے ہاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ مغائرت کے اس دور میں جب انسانی رویے بے غرض اور سچی وابستگی سے محروم ہیں اس تصور کی قدر کی جانی چاہیے۔ ان حالات میں عہد کے ایک نمائندہ شاعر کا محبت کے حوالے سے قدرے ''متعصب'' ہونا، انسان کو اس کی حقیقی تشخص کی مراجعت کا راستہ دکھانا کسی خدمت سے کم نہیں۔ گفتگو کے اس چراغ نے اپنی باتوں کی روشنی سے بڑی خاموشی کے ساتھ ایک پوری نسل کو منور کیا ہے۔

اقبال نے کسی کے نام خط میں لکھا تھا کہ ''وہ حسن ہی کیا جس میں استغنا نہ ہو''۔ اسلم انصاری کے ہاں اس نوع کے ایک حسن کی جھلک دیکھیں، یہ حسن ہر وقت شاعر کو اپنے لمس کی خواہش میں حزیں اور اداس رکھتا ہے:

اے حسنِ خود آرا و جہاں سوز و دل افروز
رکھتی ہے حزیں مجھ کو ترے لمس کی خواہش
سرمایۂ نازش ترا اک دل ہو کہ صد برگ
تو شاخ پہ نازاں ہو کہ گل دان پہ خنداں
یادستِ گل اندوز کی حدت سے گریزاں
ہوتی ہے ترے شیوۂ تزئین پہ حیرت

☆☆☆☆

اسی طرح اسلم انصاری کا تصورِ محبت ان کی نظم ''Love Letter'' میں واضح ہوتا ہے، وہ ایک سیدھا سادھا سا خط تھا، لیکن اس لیے اہم تھا کہ اس ''دستِ کرشمہ ساز'' کا لکھا ہوا تھا، نیلے ورق کی سلوٹوں میں عجلت سے تحریر کردہ وہ چند الفاظ جنہیں شاعر نے حرزِ جاں بنالیا تھا، جب کہیں

گم ہوئے تو ایک عجیب سی بے کلی دے گئے:

اب چشم و نگاہ کس کو ڈھونڈیں
وہ خط بھی نہیں ہے بہرِ تسکیں
نقطہ بھی ملے گر اس قلم کا
ہم اس کو بنائیں شہر تسکیں

☆☆☆☆

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ محبت اسلم انصاری کے ہاں ایک نا تمام تجربے کے طور پر وارد ہوئی ہے۔ پت جھڑ کے دنوں کی کوئی ادھوری سی محبت جس میں عاشق مرگِ ذات کا منظر بڑے سکون سے دیکھتا ہے اور خوش خیالی میں رہ کے فریب کھانے کے مسلسل تجربات سے گزرتا ہے، یہاں دیکھیں ایک ادھوری اور نا تمام محبت پر احساسِ رائیگانی کس طرح نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے:

شکستِ جاں کے کئی مرحلوں سے ابھرے تو
غرورِ عشق پہ تہمت تھی نارسائی کی
کھلا کہ خواب کو تعبیر کہہ نہیں سکتے
متاعِ درد کو تنویر کہہ نہیں سکتے
کھلا کہ بھول ہوئی شدتِ تمنا میں
چراغِ جاں کو کسی اور طرح جلنا تھا
رفیقِ راہ کو قاتل سمجھ کے چلنا تھا

☆☆☆☆

اسی خار وخس کے دیار میں
اسی روز وشب کی پکار میں
کوئی گل جو بادِ بہار میں

مری شاخِ جاں پہ مہک سکے!

کوئی یادِ موسمِ دار کی

کوئی بات خوئے نگار کی

کوئی صوت بلبلِ زار کی

جو سکوتِ شب میں مہک سکے

ایک اور نظم میں ''حسن'' کی مصوری دیکھیے:

سنہری، زرد رنگت

اور آنکھوں میں حیاتِ محض کی تنویر،

مرمریں لہکتے شاخ ساروں کی لچک۔۔۔

لہجے میں صوتِ بے تعین کی چمک

اور دست و بازو میں چہکتے بولتے

خونِ جواں کی گرم رفتاری۔۔۔

لباسِ خوش تراشیدہ میں حسنِ لازماں

ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اسلم انصاری کا وژن بہت بڑا ہے۔ مثلاً مشرق اور مغرب کی ثقافت اور معاشی اور معاشرتی ناہمواری کو ہی لے لیں۔ بڑے بڑے تخلیق کار ایشیا کے مے خانوں کو چھوڑ کر مغربی نائٹ کلبوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے نزدیک مشرق اور مغرب کے خدا الگ الگ تھے۔ سو اس خدا کا جنازہ بھی بڑی دھوم سے اٹھایا گیا جو مغرب کا آقا تو تھا لیکن مشرق کا نہیں۔ اس کے نتیجے میں ان شعرا کی شاعری کی ان کی زندگی میں ہی ''میت سوزی'' ہو گئی۔ اسلم انصاری نے تقلیدِ مغرب کی بجائے مشرق کو ہی اپنی خواہشوں کی سرزمین قرار دیا ہے۔ اقبال کی طرح انہیں بھی مغرب کے بازاروں کی ہر بکاؤ شے پسند نہیں۔ اپنی ایک نظم میں اسلم انصاری مشرق کو چمکتے اور دہکتے ہوئے سورجوں کی سرزمین قرار دیتے ہیں:

میرے مشرق، مری روح کے رازداں

تیرے کہنہ خریطے میں کتنی کتابوں کے اوراق ہیں

کیا کسی لوح پر میرے کشف جلی کے لیے کوئی بھی استعارہ نہیں

اس افق کے لیے (جو مرا درد ہے)

اس افق کے لیے کوئی سورج نہیں

اس جہاں کے لیے (جو مری زیست ہے)

کوئی اجلا، نکیلا ستارا نہیں

اور اس مشرق کے باشندے کی ''مشرقیت'' کا ایک روپ بھی دیکھیں:

خدا کا شکر کہ یہ آرزوئے نغمہ گری

کسی طرح سے بھی سرمایہ ہوس میں نہیں

خدا کا شکر کہ یہ شیوۂ نوا سنجی

متاعِ رنگ کی صورت کسی قفس میں نہیں

صدائے نغمہ و سازِ غزل کا حاصل فن

جہانِ مصلحت آگیں کے پیش و پس میں نہیں

جمالِ شعر کو اک عمر کا ریاض ہے شرط

یہ ہر نوائے خروشاں کی دسترس میں نہیں

ڈاکٹر اسلم انصاری کی نظم میں روحِ عصر کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں جو اپنی ذات کے معبدوں میں ''معتکف'' ہو کر خود پر شاعری کی موسموں کے نازل ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ یا دوسرے معنوں میں انہیں اپنی ذات کے دکھ سے بڑا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ کسی تخلیق کار کا کمال تو یہ ہے کہ وہ غمِ حیات کو غمِ کائنات میں مدغم کر دے۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

''ایک سچا فنکار کبھی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ جس معاشرتی جبر کے خلاف وہ کسی نہ کسی سطح پر، کسی نہ کسی طرز کے مزاحمتی عمل میں شریک ہے، وقت آنے پر وہ خود اس کا باجبروت نمائندہ بن جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معاصر دنیا میں ایک تخلیق کار کو بہت ذمہ داری کے ساتھ ''خوبصورتی'' اور ''خیالات'' کو تخلیق کرنا چاہیے۔ تاکہ دنیا ''ذہنی خوبصورتی'' کے تصور سے عاری نہ ہو جائے۔'' (**نکلمات۔ ص ۵۳**)

اسلم انصاری کے دوسرے مجموعہ کلام ''نقشِ عہدِ وصال کا'' میں شامل ایک نظم ''جن کی عمریں تھیں کہ تارے سوچیں'' کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں بوسنیا میں سربیا کے فوجیوں کے ظلم و ستم کا شکار معصوم اور زخمی بچیوں کو موضوع بنایا گیا ہے:

دستِ معصوم میں پھر زخم کھلیں گے کہ گلاب
آنے والے کسی فردا کے نئے موسم میں
آنکھ میں منظرِ خوں ہوگا کہ ہنستے ہوئے خواب
جن میں مرقوم ہو مظلوم کے زخموں کا حساب
عدل کے ہاتھ میں ہوگی بھی کبھی ایسی کتاب؟
اپنے مجروح سوالوں کو بھلا کر شب بھر
اپنی مہتاب جبینوں کو اٹھا کر شب بھر
بچیاں سوچتی ہیں،
بچیاں سوچ تو سکتی ہیں ابھی

ایک نظم ''معاشرانِ ادب، اے بلا کشانِ ہنر'' میں معاشرے کے مختلف طبقات سے ہنر آفریں تجربات شاعر کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اور وہ ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

تمھاری کاوشِ اظہار ہے متاعِ حیات
تمھاری کاوشِ پنہاں سے ہے نشانِ ہنر

تمھارے خونِ تمنا سے ہو سکے سیراب
بہارِ گلشنِ معنی و بوستانِ ہنر
تمھاری خواہش موزونیت میں ڈھلتا ہے
ہر ایک نقشِ نگاریں کہ ہے جہانِ ہنر
تمھارے حسنِ تخیل کا یہ کرشمہ ہے
کہ بندگانِ ہوس بھی ہیں بندگانِ ہنر

اردو نظم کے شعرا نے یوں تو تقریباً ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کے ہاں عموماً کائناتی شعور کا فقدان ہی دکھائی دیتا ہے۔ علامہ محمد اقبال اور مجید امجد کے ہاں البتہ اس موضوع پر مختلف حوالوں سے اظہارِ خیال ملتا ہے۔ اسلم انصاری نے اپنی نظم میں اس موضوع کو ابلاغ کا وسیلہ بنایا ہے۔ ایک نظم میں تفکر و تفلسف کے حوالے سے کائناتی دائرے میں موجود نظم کے بارے میں وہ اس طرح گویا ہوتے ہیں:

دہر میں نظم سے ہے غایتِ ہستی کا حصول
نظمِ آفاق ہو یا نظمِ خیال و الفاظ
کسی آئین سے ہے شاہدِ معنی کا ظہور
کسی دستور سے ہیں ساز، مغنی، مزمور
ربطِ احساس سے ہے رشتۂ افرادِ جہاں
حسنِ ترتیب سے ہے صورتِ ترفیعِ جمال
غیرِ قانون نہیں نغمہ و آہنگ و مقام
غیرِ آہنگ نہیں زمزمہ جاں کا قیام
نظم اک لفظ نہیں، ایک تصور ہے حقائق پہ محیط

ڈاکٹر اسلم انصاری کی نظم پر لکھے گئے اس مضمون میں اب تک ان کی فلسفیانہ اور نظریاتی جہتوں

پر روشنی ڈالی گئی ہے۔فنی حقیقت کا تعلق ان امور میں ذرا جداگانہ نوعیت کا ہے۔ایک دفعہ معروف مصور ڈیگاس نے اپنے شاعر دوست میلارمے سے پوچھا،

''میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں، لیکن میں نظم نہیں لکھ پاتا''

میلارمے نے جواب میں کہا

''میرے پیارے دوست!نظمیں خیالات سے نہیں الفاظ سے تخلیق ہوتی ہیں''

خیال کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن فن کے بغیر فنکاری نہیں۔اس کی مثال ایک سڑکیں بنانے والے انجینئر اور سنگ تراش سے دی جاسکتی ہے۔معاشرے کے افادی پہلوؤں کے حوالے سے ایک سڑک بنانے والا بھی سنگ تراش کی طرح پتھروں کو استعمال میں لاتا ہے۔اس کی بنائی ہوئی سڑک کسی نہ کسی منزل کی نشان دہی بھی کرتی ہے لیکن سنگ تراش کا فن خود اسی کی طرف عود کر آتا ہے۔ایک ارفع خیالات وتصورات سے مالا مال شخص اگر فنی حوالوں سے شاعری کو نہیں سمجھتا تو وہ ایک صحافی یا کالم نگار تو بن سکتا ہے لیکن شاعر نہیں۔شاعر بننے کے لیے خوبصورت الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی متوازن ترتیب سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ہماری آج کی نظم خالص تجریدیت کی وجہ سے ایک معمہ بن کر رہ گئی ہے۔ہمارا شاعر ہر لحہ خیالوں اور خوابوں کی آہنی صلیب پر آویزاں رہتا ہے، بھول بھلیاں اس کا مقدر ہیں۔فن سے دوری کی وجہ سے اس کے ہاں ماچس کی تیلیاں، بیدِ مجنوں بنتے بنتے یکا یک کسی دوشیزہ کا دست حنائی بن جاتی ہیں۔یوں نظم تخلیقی اور فنی شان کھو کر محض کرافٹنگ کی مدد سے امیجز کی کٹی پھٹی اشکال میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کے بے رنگ لینڈ اسکیپ میں عورتوں کے ننگی مجسمے فرائیڈ کے ایڈی پس کمپلیکس کا روپ دھار لیتے ہیں، اس نوع کی فنی حسن سے عاری نظمیں آج کے قاری سے بھرپور رابطے میں نہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے فنی لحاظ سے اس ادھوری جدیدیت اور تلازموں کے آزادانہ استعمال سے گریز کیا ہے۔ان کی نظم کلاسیکیت کی گود میں آنکھیں کھولتی ہے، یوں جدید موضوعات کے ساتھ مہارت ان کی نظم کو ایک مختلف نوعیت کی شان عطا کرتی ہے۔ایک نظم ''کیا صدا تھی کہ شب تار میں

تھی،' میں دیکھیے کس طرح تشبیہات کا خوبصورت استعمال ہوا ہے:

کیا صدا تھی کہ شب تار میں تھی؟
درِ احساس سے ٹکرائی بگولوں کی طرح
خانہ وہم میں لگتی تھی ہیولوں کی طرح
جیسے نغمات ہوں یک لخت مبدّل بخروش
جیسے اٹھا ہو کہیں سینۂ مظلوم میں جوش
جیسے اٹھی ہو کوئی شاخِ چمن تیغ بدست
جیسے پت جھڑ کی ہو ناکام سی کوئی کوشش

اور اسی طرح ایک جگہ تمثالوں کی کارفرمائی دیکھیں:

پسِ دیوار تھی
یا دور کی بستی سے ادھر آئی تھی؟
کون کہہ سکتا ہے وہ کس کے لیے کیا لائی تھی؟
ایک آہٹ سی کہیں قریۂ بیدار میں تھی
کوئی ٹوٹی ہوئی کشتی کہیں منجھدار میں تھی
ایک جھنکار سی سوئی ہوئی زنجیر کی تھی
سنسنی سی کسی طاقت سے کھنچے تیر کی تھی
وہ کسی زخمی پرندے کی صدا تھی شاید
کسی بچے کی دعا تھی شاید
یا فقط موجِ ہوا تھی شاید

ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنی نظم میں فکری اور فنی حوالے سے جن موضوعات کو وسیلہ بنایا ہے اس سے ان کی ذہنی اور لسانی تربیت میں شامل فارسی اور اردو کے اساتذہ سے کسبِ فیض کا بخوبی

اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رویہ جہاں اسلم انصاری کو کوری روایت پرستی کے خلاف کھڑا کرتا ہے وہاں بے معنی انحراف سے بھی بچاتا ہے۔ یہ ایک ایسے شاعر کی نظمیں ہیں جو لطف و معنی کی علامت ہے اور وقت کے محور پر زندہ رہنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی رباعی

کہا جاتا ہے کہ رباعی سیرت کے لحاظ سے مختصر نظم ہے اور صورت کے اعتبار سے مختصر غزل۔ یہ اپنی جامع حیثیت کی وجہ سے اصنافِ سخن میں محور کن سمجھی جاتی ہے۔ زحافات و تغیرات کی کثرت اسے نثر کے قریب کر دیتی ہے۔ رباعی شاید وہ واحد صنف ہے جس میں نثر اور نظم دونوں کے خوبصورت پہلو سمٹ آئے ہیں۔ محمد ارشاد کے مطابق:

''ساخت کے لحاظ سے رباعی پچیس تیس الفاظ سے ترکیب پذیر چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ الفاظ کی ان پچیس، تیس اینٹوں سے تعمیر اس حریم یا چاردیواری کے اندر جہانِ معنی آباد ہے جہانِ چارسو اور ماورائے چارسو کا۔''

(رباعی کی تکنیک اور فن ص۲۹)

اہل علم کے ہاں رباعی کے لیے ترانہ، دوبیتی اور چہار بیتی کی اصطلاحیں رائج رہی ہیں۔ رباعی خالص عجمی صنف ہے۔ شیخ سعدی شیرازی کے ہم عصر شاعر شمس قیس رازی کا اس کی ابتدا کے بارے میں موقف ہے:

"یکے از متقدمان شعرائے عجم، پندارم، رودکی، واللہ اعلم، از نوع اخرب و اخرم این بحروز نے تخریج کردہ است و آں را وزن رباعی خوانند"

اس کی تخریج کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شاعر نے غزنی شہر کے مضافات میں گھومتے ہوئے یعقوب بن لیث صفاری کے لڑکے کو اخروٹ کھیلتے دیکھا۔ ایک اخروٹ لڑھکتے ہوئے سوراخ میں گرنے لگا تو لڑکے نے کہا:

شاعر نے اس مصرعے یا جملے کو موزوں پا کر اس پر تین اور مصرعے لگا دیے، یوں رباعی نے صورت پائی۔ رباعی کی بہت سی مروج تعریفوں میں سے ایک یہ ہے:

"A Quatarain composed of two distichs, or four hemistichs, three of which, namely the first, second and fourth, rhyme together. Each hemistich is of the measure تن تن تتتن تن تتتن تن تتتن (Tan-Tan-Tatatan-Tan-Tatatan-Tan-Tatatan) as the famous robayyat of the poet Omar Khayam"

اردو میں رباعی گو شعرا کی تعداد مخصوص رہی ہے۔ بڑی بڑی سنگ لاخ زمینوں میں استادانہ غزل کہنے والے شعرا کے پاؤں بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے لڑکھڑا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے پیش نظر ہمیشہ سے رباعی کی روایت رہی ہے اور اس کے اثرات ان کے ہاں دکھائی بھی دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس صنف کو صرف ہیئت کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قافیے کی قید سے آزاد ''رباعیاتِ معریٰ'' لکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اسلم [illegible] کی رباعی کی لفاظی اردو کی روایتی رباعی سے قطعاً مختلف ہے۔ ان کے خیال میں:

[illegible] دلچسپی کا ایک [illegible] بزرگ دوست اور معروف نقاد جابر علی سید کی طویل [illegible] کے بز[illegible] رباعی گو [illegible]۔ ان [illegible] حوصلہ افزائی سے میں نے [illegible] شروع کی۔ رباعی (جسے میں گوشۂ تفکر قرار دیتا ہوں) کو میں نے رباعی کے [illegible] تصورات کے مقابلے میں ایک صنفِ نظم کے طور پر قبول کیا ہے جو ہم سے فن کی [illegible] کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میری رباعی جدید حیات اور جدید طرزِ فکر کی

حال ہے۔ یہ روایتی خیال کہ رباعی کے چوتھے مصرعے کو ہر حال میں زوردار ہونا چاہیے میں نے قبول نہیں کیا۔ اسی طرح رباعی کو صرف اخلاقی فلسفیانہ یا حکیمانہ خیالات تک محدود رکھنے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ محض رندانہ مضامین یا حیاتی (جنس یا نیم جنس) موضوعات کو بھی میں پسند نہیں کرتا۔ بلکہ میں رباعی کو جدید شاعری کے موضوعات اور اپنے عہد کے قریب لے آیا ہوں۔'' **(گفتگو کا چراغ۔ ص ۱۷۰)**

ڈاکٹر اسلم انصاری کی رباعی میں موضوعات کی یکسانیت نہیں۔ انہوں نے اپنا چراغ فکر تو روایت سے ہی جلایا ہے لیکن اپنے مضامین کو عہدِ حاضر کے مسائل کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی ہے۔ رباعی لکھنے کے لیے جس بے پناہ مشاقی اور بے نہایت دیدہ وری کی ضرورت ہوتی ہے اسلم انصاری کے ہاں اس کی موجودگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ذرا دیکھیے قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے ہیں:

ادراک کے آئینے کو میلا نہ کرو
اس عہدِ درخشاں میں تو ایسا نہ کرو
انسان ہے دنیا کی گراں مایہ متاع
لوگو! کسی انسان سے دھوکا نہ کرو

☆☆☆☆

مکتب میں گزارا ہوا لمحہ بھی بہت
حاصل ہو تو اس باغ کا پتا بھی بہت
تادیب میسر ہو تو غفلت بھی شعور
دیوارِ دبستاں کا ہے سایہ بھی بہت

☆☆☆☆

وہ ماہ تھا اور ماہ سے بڑھ کر رخشاں

خورشید تھا، خورشید سے بڑھ کر تاباں

وہ گل تھا مگر گل سے کہیں نازک تر

وہ سرو تھا اور سرو سے بڑھ کا نازاں

☆☆☆☆

رباعی کہنے والے شاعر کے پیش نظر نظم نما نثر یا نثر نما نظم کی ساخت میں کم سے کم وقت میں قدرے تفصیل سے بات کہنا مقصود ہوتا ہے اس لیے اس کی ہیئت پر گرفت آسان کام نہیں۔ اسلم انصاری کی رباعیات میں نظم کے زیر اثر تخیل یا امیجری کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔ ڈرائنگ روم میں لگی تصویر سے لے کر کارخانہء عالم کی رعنائیوں تک کے سبھی مناظر ان کے ہاں بڑی خوبصورتی سے رونما ہوتے ہیں۔ یقیناً اسلم انصاری کی رباعیات کو پڑھ کر فطرت کی رنگینیاں اور بھی واضح ہو جاتی ہیں:

لہرایا اداسی نے جب اپنا آنچل

شاخوں پہ پرندے ہوئے بوجھل، بے کل

اک یاد مچلنے لگی دریا دریا

اک شام اترنے لگی جنگل جنگل

☆☆☆☆

صحراؤں کی دوری سے ندا سنتا ہوں

کچھ کہتی ہے جب تیز ہوا سنتا ہوں

ساحل سے سمیٹ آتا ہوں موجوں کا سکوت

اور گھر میں سمندر کی صدا سنتا ہوں

ڈاکٹر اسلم انصاری کی رباعی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے جاوید اصغر لکھتے ہیں:

''انسانی جذبات اور زندگی کے مشاہدات بیان کر کے اسلم نے نہ صرف رباعی کو دلچسپ اور قابلِ توجہ صنفِ سخن بنا دیا ہے بلکہ رباعی کو فلسفیانہ مباحث سے دور لے گئے ہیں۔ رباعی کو نیا ڈکشن اور نیا ذخیرہ الفاظ دیا ہے۔ یہ ذخیرہ الفاظ ایک طرف رباعی کو عصرِ حاضر کی شعری اور ادبی زبان سے مربوط کرتا ہے تو دوسری طرف اس صنف کو اظہارِ ذات کا ایک قرینہ دیتا ہے جو زندگی کے تہ در تہ جذبات و احساسات، پیچ در پیچ تجربات اور تصورات و بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔'' (گفتگو کا حراغ ص ۱۱۲)

عہد حاضر کے صنعتی معاشرے میں انسانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، طبقاتی ناہمواری اور امنِ عامہ کی خراب صورت حال نے آج کے انسان کو میر تقی میر کے دور سے جا ملایا ہے۔ اسلم انصاری کے ہاں دیکھیے کس طرح اپنے عہد کی نوحہ گری ملتی ہے:

نادار کا دنیا میں عبث جینا ہے
غم کھانا اور خونِ جگر پینا ہے
اک نامۂ بے مہر ہے اس کی تقدیر
اک جامۂ صد چاک، اسے سینا ہے

☆☆☆☆

کب تک غمِ بے حرف کی شدت سہتے
کب تک نہ کسی سے اپنی بپتا کہتے
انسان تھے، جینے کا خیال آ ہی گیا
دریا بھی نہیں ایک کنارے بہتے

☆☆☆☆

رباعی میں اگرچہ فکر کو اولیت حاصل ہے لیکن اسلم انصاری نے ''فکر آمیز جذبات کا ایک

خوبصورت انداز بھی متعارف کروایا ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

تابندگیِ شام و سحر باقی ہے
گل پوش تھی جو راہ گزر، باقی ہے
تو منظرِ موجود میں موجود نہیں
لیکن ترا افسونِ نظر باقی ہے

☆☆☆☆

کچھ دیر کو ٹھہرے ہوئے لمحے چمکے
پتوں پہ گری اوس، شگوفے چمکے
جب آخرِ شب چاند ترا عکس بنا
پلکوں پہ مری کتنے ستارے چمکے

☆☆☆☆

تعمیر فنا اور تمنا حسرت
بن کے بگڑ جاتی ہے حیرت حیرت
جب کہنہ سرا میں کوئی دیوار گرے
ہر خشت یہ کہتی ہے کہ عبرت عبرت

☆☆☆☆

موجودہ عہد میں تنگی وقت کی وجہ سے مختصر نظم کے ضمن میں مختلف اصناف کو اردو میں متعارف کرایا گیا ہے۔ مثلاً ہائیکو، واہی، ماہیا اور کہہ مکرنی وغیرہ۔ بدقسمتی سے ان کو قبولیت عام کا درجہ نہیں مل سکا۔ اسلم انصاری کا ''رباعیاتِ معریٰ'' کا تجربہ اس سلسلے میں آنے والے عہد کے معیار پہ پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کی اولین بے قافیہ رباعیاں ہیں:

اے میرے خیال گل بداماں، تو نے
بخشے ہیں ہزار نقشِ رنگیں مجھ کو
ہیں تیرے بغیر شہر و صحرا سونے
تو ہے تو ہے اک شاخِ گل بھی گلشن

☆☆☆☆

پتوں پہ گری ہیں رس کی بوندیں کیسی
پلکوں پہ دمک اٹھے ہیں تارے کیا کیا
جاگی ہیں نہ جانے کتنی ہی تصویریں
یاد آئے ہیں دل کو جانے والے کتنے

ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری

برصغیر کے لوگوں کا فارسی سے رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنے قدیم خود یہ دونوں ملک ہیں۔ رگ وید میں ایران اور اوستا میں ہندستان کے بارے میں معلوماتی اشارے ملتے ہیں۔ سنسکرت اور قدیم ساسانی زبانوں میں کافی مشابہت ہے۔ ایرانی کاریگروں نے پاٹلی پترا میں، چندر گپت موریا کے عہد میں ہندستانی لوگوں کو پتھر تراشنے اور لکڑی کے محل تعمیر کرنے کے طریقے سکھائے۔ اسی طرح پنڈت کیفی کے مطابق:

''ہندوستان راجاؤں کے ایرانی حکومتوں کے ساتھ سیاسی روابط تھے۔ ان کے دیوان رسایل میں فارسی نویس ہندو موجود تھے۔'' (**کیفویہ۔ ص ۱۲**)

''محمد بن قاسم کے لشکر میں بھی فارسی گو موجود تھے کیوں کہ ہند پر حملہ آور ہونے سے پہلے اس کی فوج کا کیمپ کئی ماہ تک شیراز میں قائم رہا۔ فارسی کو باضابطہ طور پر برصغیر میں پھیلانے کی سعادت غزنویوں کو حاصل ہوئی۔'' (**فارسی ادب کی مختصر تاریخ۔ ص ۸۱**)

اس عہد میں ابتداً مسعود سعد سلمان لاہوری، فرخی، عنصری اور عسجدی وغیرہ نے اس سرزمین پر قدم رکھا، بعد کے عہد میں فیضی اکبر آبادی، خسرو، غنی کاشمیری، ناصر سرہندی، بیدل عظیم آبادی، طالب آملی، ظہوری، سرمد سعید، صائب اور غالب کے نام اہم ہیں۔ جب برصغیر میں مسلم تہذیب کا سرچشمہ خشک ہوا تو فارسی زبان و ادب کی سرکاری سرپرستی بھی ختم ہونے لگی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''اورنگ زیب کے طویل دورِ حکومت میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ اردو زبان، فارسی کی جگہ

لینے کی تیاری کر رہی ہے۔" (**تاریخ ادب اردو. جلد اول. ص ۷۷**)

فارسی کی سرکاری حیثیت ختم ہونے کے باوجود شبلی نعمانی، مولانا گرامی، عزیز لکھنوی، مہر علی شاہ گولڑوی، علامہ محمد اقبال، طغرائی امرتسری، ظفر علی خان، ے کش درانی، عنایت اللہ مشرقی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا عظامی اور الیاس عشقی وغیرہ نے فارسی شاعری کے ذریعے مسلم کلچر کی باقیات کو "حنوط" کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شعر گوئی کا رشتہ بھی برصغیر کی اسی علمی تاریخ میں اپنا وجود ثابت کرتا ہے۔ ہمارے ہاں "پڑھو فارسی بیچو تیل" جیسی نوع کے محاوروں کی موجودگی کے سبب فارسی ادب سے شغف رکھنے والوں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے، اس کے باوجود ڈاکٹر اسلم انصاری نے بڑے تسلسل کے ساتھ فارسی میں شاعری کی ہے۔ ان کا فارسی ادب سے رشتہ "فلرٹ" کرنے کا نہیں، بلکہ اس کی حیثیت دائمی ہے۔ کہتے ہیں:

> میرا گھرانہ تین چار پشتوں سے فارسی زبان و ادب کا حامل رہا ہے۔ دوسرا مجھے زمانہ طالب علمی میں چار سال تک فارسی زبان وادب پڑھنے کا موقع پروفسر تاج محمد خان سے ملا۔ اسی زمانے میں اقبال کی فارسی غزلوں نے میرے دل میں گھر کر لیا اور میں اقبال کی فارسی زمینوں میں غزلیں کہنے لگا۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں اقبال کے فکر وفن پر مقالات لکھنے میں مصروف تھا اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو اس عالم میں پایا کہ فارسی مثنوی کے اجزا قلم بند کر رہا تھا۔ اقبال کے 'جاوید نامہ' کی طرز پر میں نے اس کا نام 'فرخ نامہ' رکھا۔" (**گفتگو کا چراغ. ص ۱۱۴**)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے فارسی شاعری کے کلاسیکی سرمائے کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کر رکھا ہے۔ مرزا غالب اور علامہ اقبال کی طرح بیدل عظیم آبادی سے انہیں والہانہ لگاؤ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

من بیدل کہ اسم نام دارم گہی جانی تخلص نیّر ارم
چہ میگویم، چہ حال و کاردارم زخود چندی سر گفتار دارم

تـعـــارف بـر طـرف بشـنـو کیـم مـن زخـود خـواهــان و خـود کـامـان نیم من

اسی طرح ایک جگہ حافظ شیرازی کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

شـنو حافظ، که هستی آسمانی (تـرامـن "آسـمـانـی" نـام دادم)
جهـان. مـا اگـر روزی سر آید فـقـط ایـن آرزو دارم که "تنها
مـن دلـدادنــه تو هم بورزم چـو تو ورزیده ای عشقِ نگاران

بسـر بـر دن چـو تـو ایـن زندگـانی
مـرا سـرمـایــه صد افتخـار است

ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری میں آسمانی مذاہب کی معروف تلمیحات وتوارخ کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ بعض واقعات سے حد درجہ متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایک نظم ''صدای ہارون درکوہ پایہ طور'' میں ان کا اسلوب شاعری دیکھیں:

چــه غـوغـا خـاسـت انـدر وادی طـور کـه عـرسـو بـانـگ زد عـرجـان بـی نـور
هـر آوازی کـه زیـن صـحـرا بـیـایـد بـقـلـب مـردمـان وحـشـت فـزایـد
بـد لـهـانـی کـه ازلـطف خـداونـد بـنـوده عـیـچـگـه بـی ذکـر خورسند
خـیـال سیـم و زرچـون جـانـگـزیـن شد هـمـیـن دانـم کـه شیطان در کمین شد

علامہ اقبال چوں کہ اسلم انصاری کی محبوب شخصیات میں شامل ہیں۔ ان کا اہم تنقیدی سرمایہ بھی فکرِ اقبال کی عالمانہ اور فلسفیانہ تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے اس لیے اپنی فارسی شاعری میں بھی وہ اقبال کے تصورات سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال اور اقبال کے نظریات کو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے دیکھنے کا عمل اسلم انصاری کو دیگر ''عشاقِ اقبال'' سے قدرے علاحدہ اور منفرد کرتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اگـر امـروز بـا مـابـود اقـبـال زغـم عـرگـز نـمـی أسـود اقـبـال
چودیدی عافیت ازدهر بگر یخت چـه اشک خـون کـه ازدیده نمی ریخت
جهـان از شـور نـالـه پر خروش است فـغـان خستگـان آزار گـوش است
بـعـالـم آدمیـت را زوال اسـت بشـر را زنـدگـی کـردن وبـال اسـت

اقبال کے موضوعات بھی اسلم انصاری کے لیے قابل کشش ہیں۔ ایک جگہ "پندِ سودمند" کے عنوان سے خودی اور ناخودی کی بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خودی نوراست و شمعِ بزمِ دنیاست
خودی جلوہ نما و محفل آراست
ولیکن ناخودی ہم درکمین است
خودی را غیر اگر باشد ہمین است
خودی جبریلِ لحنِ آدمیت
خروش ناخودی بار سماعت
انا الحق گر خودی گوید، خطانیست
وگر از ناخودی یاشد، روانیست

اسلم انصاری کی پیدائش ملتان میں ہوئی اور ان کی زندگی کا ایک طویل حصہ اسی شہر کہنہ میں گزرا۔ اسلم انصاری کو ملتانی طرزِ زندگی اور اندازِ تعمیر میں سمرقند اور بخارا کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ چند فارسی اشعار میں مدینۃ الاولیا ملتان کو شہرِ عرفان اور پاکستان کا اصفہان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

مرا میہن نہ تبریز و نہ روم است
کہ خاکِ پاکِ ملتان مرزوبوم است
چہ ملتان؟ اصفہانِ کشور پاک
بموجِ عشق، ہر شاخیست نمناک
تجلی زار ، اربابِ صفارا
قدم گاہیست، خیل اصفیارا
زہی ملتان، زہی شہرِ کرامت
خدا آباد دارش تا قیامت

ڈاکٹر اسلم انصاری کے فارسی کے شعری سرمائے میں ایک قابلِ توجہ تصنیف ان کی مثنوی ''فرخ نامہ'' بھی ہے۔اس طویل مثنوی کے بارے میں جاوید اصغر کا خیال ہے کہ:''اس مثنوی کا موضوع وہی ہے جو''ڈوائن کامیڈی''اور''جاوید نامہ'' کا ہے یعنی عالمِ بالا کی سیر۔موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یہ مثنوی بہت حد تک اقبال کی مثنوی''جاوید نامہ'' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔''(گفتگو کا چراغ۔ص ۱۱۵)

اس مثنوی میں ڈاکٹر اسلم انصاری، شیخ سعدی، مولوی رومی اور علامہ اقبال کی رہنمائی میں یہ خیالی سفر کرتے ہیں۔مغربی مفکرین کا ذکر بھی ضرورت کے تحت آیا ہے۔معروف جرمن شاعر گوئٹے نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی شان میں نعتیہ نظم'' The Mahomets Gesang''لکھی تھی۔جس کا اولین فارسی ترجمہ علامہ اقبال نے''جوئے آب'' کے نام سے کیا، بعدازاں شان الحق حقی، احتشام حسین اور چند دیگر شعرا نے بھی اس کے تراجم کیے۔گوئٹے اسلام کی سرمدی حیثیت سے آگاہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ نزع کے وقت ابدی حسن وصداقت کے روبہ رو ہوا تو''روشنی تیز کردو'' کے الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔گوئٹے کی''نعتیہ نظم'' کا یوں آغاز ہوتا ہے:

Seht den felesnqüell,

Freüdehell,

Wie ein Sternenblick;

Uber wolken

Nahrten Skine jugend

Güte Geister

Zwischan Klippen in Gebüseh

گوئٹے کے سرکارِ دوعالم ﷺ سے محبت اور مؤدت کے اس رشتے کی وجہ سے ڈاکٹر اسلم انصاری نے اسے بہشت کے ابتدائی درجے میں دیکھا ہے۔ گوئٹے کے علاوہ شیکسپیئر، ایمرسن اور برگساں وغیرہ کا ذکر بھی اس مثنوی میں آیا ہے۔ ''فرخ نامہ'' میں بعض مفکرین مثلاً افلاطون وغیرہ کو برزخ کے آخری مدارج پر دیکھا گیا ہے جہاں وہ ذاتِ خداوندی کے دیدار کے منتظر ہیں۔ اس مثنوی میں شاعر کے ہاں ایک خاص قسم کی سکینتِ قلب محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران ملتان کے ڈائریکٹر محمد علی رحیمی مرحوم کہتے ہیں:

شعرای بزرگ چون شیخ فخرالدین عراقی، امیر خسرو دہلوی، میر سادات حسینی ہروی وغیرہ ازھمین خطہ برخاستہ اند۔ استادِ عزیز و گرانمایہ پروفسور اسلم انصاری نیز یکی دیگر از فرزندانِ ملتان است کہ ۱۳۰۰۰ قطعہ شعر بزبانِ فارسی سرودہ است۔۔۔ مزید توفیق استاد انصاری دارد خدمت بہ فرھنگِ اسلام و زبان و ادب فارسی از خداوندِ بزرگ مسئلت می نماید۔'' (چراغ لالہ۔ ص۱۱)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی فارسی غزل کو زیرِ بحث لانا بھی ضروری ہے۔ ان کی غزل پر علامہ اقبال کے برعکس حافظ، نظیری، بیدل اور غالب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ غزلیں جہاں حسن و عشق کو موضوع بناتی ہیں وہاں ان میں تعقل و تفکر کے نقوش بھی موجود ہیں۔ ان غزلوں کا قاری ایک خاص قسم کی معنویت سے آگاہ ہوتا ہے:

بھر رہ دیدام صد محمل گل
نمی دارم سراغ منزل گل
بدر یا صد گھر بیتاب باشد
کہ بیند رنگ ھای ساحلِ گل
چہ باشد در دل نازک خیالاں
چہ باشد عقدہ ھای مشکل گل

ایک غزل میں ''مابینِ من وتو'' گفتگو کا ایک خوبصورت منظر دیکھیں، شاعر نے بڑی خوبصورتی سے الفاظ کے چابک دستانہ استعمال سے معنی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے:

گفتمش: آخر چرا برهم شدی ای یار! گفت:
پرسشت بیجاست، گفتم: اینچنین رفتار؟ گفت:
دیدنِ مابس بود اهل هوس را، گفتمش:
عشق ما پیداست از گفتار و از کردار، گفت:
گر وفاداری بیای و داغهای دل نما
گفتمش: اینک ببین این داغ و زخمِ خار، گفت:
جزپی اهل وفا حرفی نریزد نطق ما
گفتمش: آنان کیانند؟ آن بت شهکار، گفت:

ایک اور فارسی غزل کے مطلع میں غم زدوں کو بہار کی آمد کی خوش خبری سنائی گئی ہے، کیوں کہ بہار سے ہی محبوب کی آمد مشروط ہے:

آئینه دارِ رخ خوب نگار است بهار
مژده ای غم زدگان قاصد یار است بهار
سالها هست که بی سازو نواییم اسلم
پی دلهای حزین و نغمه تار است بهار

اوراب آخر میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے ایک غزل کے خوبصورت اشعار دیکھیں:

اگر زان گل نبودی آب و رنگ نقش عنوانها
عبارت را ندیدی دفتر اوراق بستانها
به راه آن نگار کم نمای عالم افروزی
همی پوید، همی جوید، چه پیدا هاچه پنها نها

ڈاکٹر اسلم انصاری کی انگریزی شاعری

عالمگیریت کے موجودہ دور میں تہذیبی، عسکری اور اقتصادی حوالے سے تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک کی ترقی کا تصور مضبوط ممالک سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ عالمی منظرنامے میں بدلتے ہوئے سماجی میلانات، مذہبی اقدار اور سکتی لسانیات کی وجہ سے یورپی کلچر کے ساتھ ساتھ وہاں کی زبانوں خصوصاً انگریزی کے اثرات سے کس کو مفر ہے؟ جب کسی زبان کے معاشرتی سطح پر اثرات مرتسم ہوتے ہیں تو وہاں کی شاعری اور دیگر اصناف سخن بھی اس کے زیر اثر نئے رنگ اور روپ میں ڈھلتی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے عالم گیریت کے اثرات ہی کے سبب انگریزی شاعری کی۔ اپنے انگریزی نظموں کے مجموعے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

English still holds a special position in the development and even nourishment of our intellectual life. Our being bilingual or multiligual has placed us in a rather advantageous position. It is through English that we have known Shakespeare, Milton, Shelley, Byron and Keats as familiarly as we have known Rumi, Sa'di, Hafiz or Mir, Sauda, Ghalib and Iqbal" (Lotus and the sandwaves. p11)

اسلم انصاری کی انگریزی نظموں میں ملتان کے صوفیا کرام کے انسان دوستی اور رواداری پر

مشتمل نظریات کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس کے علاوہ جنوبی پنجاب کی زندگی اور اس سے منسلک درد و آلام کی صورت گری کے کئی رنگ بھی اس میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اسلم انصاری نے سرائیکی کے عظیم شاعر خواجہ غلام فریدؒ (کوٹ مٹھن) کی کافیوں کے (بالاشتراک ڈاکٹر جیلانی کامران) تراجم بھی کیے۔ جو "Kafees" کے نام سے شائع ہوئے لیکن ان کی تخلیقی نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ اپنی نظموں میں انگریزی شاعری کے روایتی میٹر اور ذریعہ اظہار کے طریق کار پر مکمل قادر دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"In the light of my own experience, I can say that a major part of what is contained in the following pages, I could express only on English" (Lotus and the sandwaves. p12)

اسلم انصاری اپنی انگریزی نظموں میں انگریزی زباں کے مختلف ادوار میں کی جانے والی شاعری کے پیچ و خم سے آشنا ہیں۔ انگریزی شاعری کی روایت سے ان کی مکمل آگاہی کے حوالے سے رائے دیتے ہوئے بدرالدین احمد رقم طراز ہیں:

"I find in this collection of his deep traces of influence on him of such English poets as Spenser, Donne, Milton, Shelley, Browning, Hopkins and Eliot. I also detect in his poetry a dye of that passivity which we find in some of Shelley's Immortal Lovelyrics." (Lotus and the sandwaves. p18)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی انگریزی نظموں میں محبت کے کئی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا "تصور

حسن" انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات کو ذات سے کائنات کی طرف لے کر
بڑھتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

I have known her since long

From a distance alone, indeed;

Never she knows if ever She's wrong,

To be right being her only creed.

Her beuty, of course, is skin-deep

Yet only she once has to smile

To make a fond lover crawl and creed

Thus cover a distance of a mile

(She)

You are poetry itself

With rhythm of your accent

Note by note your speak

as if a Beethoven were composing his

smphony in ideas

O that eternal song of life!

The creator wrote you in verse!

Why waste your life - like word's

On those who would be no more with you

They have their own ways to go

You know it better than i

Who simply stand and wait

(You are poetry itself)

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسلم انصاری کی انگریزی نظموں کا اسلوب (ان کے اپنے محاوراتی اجتہاد کے علاوہ) روایتی انگریزی نظم کا پرتو ہے لیکن ان کے موضوعات زیادہ تر مشرقی علوم اور ان سے منسلک مشاہیر کے افکار و تصورات کا آئینہ ہیں۔ ''مشرق'' ان کے لیے ایک خاص روحانیت سے معمور زندگی کا استعارہ ہے۔ اور علومِ مشرق ایسے سورج کے مانند ہیں جو ''مشرق'' سے طلوع ہوتا ہے اور دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ ان نظموں کے موضوعات اردگرد بکھری زندگی سے اخذ شدہ ہیں، اور مغربی قدروں سے مرعوب ہوئے بغیر ایک دائرے کی طرح مائل بہ وسعت ہو کر آفاقیت کی طرف رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔ شفاعت یار خان نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

"In many of his poems, Mr. Aslam Ansari seems to be asserting that the universe is a series of reflections and shadows, being perceived by human conciousness and progressively being reduced by his creative self to intellingible correlations." (Lotus and the sandwaves. p21)

یہاں ایک نظم ''Exordium'' کا ایک حصہ دیکھیے:

Rise, saki, and arrange a banquet,

Pour of the wine of yester year into the cup of

today.

Look into the faces of the heartless thirsty;

Open thy eyes and see the ardour of the

assembly.

The possessions of yesterday are drifted

away by the wind.

☆☆☆☆
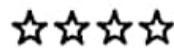
یہ نظم ایک خاص انداز میں اپنے موضوعاتی ارتقا کی طرف بڑھتی ہے۔اوراس مرحلے پراپنے کلائی میکس کو چھو لیتی ہے جب شاعر یہ کہتا ہے:

"The world of awareness is not well-founded"

ڈاکٹر اسلم انصاری کی تین نظمیں "پاکستان کے صحرائی پھولوں" کا گل دستہ لگتی ہیں۔ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شاعر پاکستان کے "خواب نگر" کا باشندہ ہے۔ان نظموں میں وطنِ عزیز کے سرائیکی خطے کی بودوباش اور طرزِ زندگی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔مذکورہ نظموں میں ایک اہم نظم "Fort Derawar" ہے جس میں چولستان کے قلعہ دراوڑ کی ایک تصویر دیکھیے:

To look at a fortress of clay in the desert

(Idealized)

Is to look at a piece of milleniums of

fossilized

. .On the brownish sands of which it seems a

part;

It's content to continue as a monument of a

sort.

(Fort Derawar)

اسی طرح ڈاکٹر اسلم انصاری نے ایک نظم ''I am no homer'' اپنے قدیم روایات کے امین شہر ملتان کے لیے بھی لکھی ہے۔ یہ نظم دراصل ''شہر آشوب'' کی جدید شکل ہے۔ شاعر نظم میں جب آزادی کی خاطر جانیں قربان کر دینے والے جوانوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کا طرزِ تحریر خاصا جذباتی ہو جاتا ہے:

I have also cherished a latent desire to sing

In honour of the freedom-fighters of the

distant past

Who fought, defending their honour and

homeland

(I am no homer)

آخر میں شاعر اس نظم کو شہر کے دکھوں کا نوحہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

It's no epic,

But a sadly song song for the city

And its obscure defenders for whom no

epitaphs

Where commposed and no minarets erected.

(I am no homer)

کسی شاعر کے خیالات کو اگر دوسری زبان میں منتقل کرنا ہو تو مترجم کی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس کا ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کے خوبصورت تراجم کیے ہیں۔ ان کی قرأت کرنے سے ان کے ترجمہ ہونے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ اگرچہ ترجمہ ہیں لیکن ان میں تخلیقیت کے رنگ موجود ہیں۔ یہاں خواجہ فریدؒ کی سرائیکی کافی ''پیلو پکیاں نی'' کے انگریزی ترجمے کا ایک طویل اقتباس ملاحظہ ہو:

Peeloo are ripe, my friend

Come and join me to pick them!

Peeloos are ripe and fresh and beautiful

Here now again. come and see

How rich in the desert

For having the wealth

Of such sweet peeloos in infinite colours!

O come my friend for peelos are ripe:

Some are white, some are green, some

yellow,

Some brown, some grey, some slightly

bluish,

Some others are violet and red, like roses,

Nature does seem to rejoice

In her own expression!

By virtue of these peeloos,

This only fruit of the sands,

The desert is no less greaceful

Than a rose-garden in heaven.

O spirit of gloom and sorrow!

Your roots would suck no more

The purer blood of my soil!

There's life here now, life and bliss,

Now-and ever to be!

(The peeloo pickers)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی انگریزی شاعری عالمی سطح پر اپنے تہذیبی اور علمی اثاثے کو متعارف کروانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر اسلم انصاری کا تنقیدی شعور تین زاویوں سے اہم ہے۔ پہلا زاویہ مختلف اصناف شعری میں ان کا مشرقی و مغربی، دونوں علوم کا عالم ہونا۔ دوسرا زاویہ، فن پاروں کے پس منظر میں موجود السیاتی تناظر کی نشان دہی کرنا اور تیسرا اسلوب کے حوالے سے ایک نیا انداز متعارف کروانا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے مطابق:

''اچھے نقاد کے ہاں ادب کے نظری و فنی مباحث کا بسیط علم اور اس کے عملی اطلاق کا ملکہ پایا جاتا ہے۔ یہ زاویہ نگاہ محض اس کی انفرادیت کا اعلامیہ نہیں ہوتا، بلکہ تخلیقی ادب کے وسیع مطالعے، تجزیاتی جائزے اور خود تخلیقی عمل کے گزرنے کے بعد ایک نامیاتی وجود کی طرح زاویہ نظر خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔'' (اوراق. شمارہ ۱۱. ص۱۲۹)

ڈاکٹر اسلم انصاری کا تنقیدی شعور معیار کی اس کسوٹی پر بہ طریق احسن پورا اترتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ وہ تتبع کے نقاد نہیں بلکہ ان کے ہاں موجود تنقیدی بصیرت میں تحقیقی رجحان بھی موجود ہے اور انہوں نے اپنے لیے تنقید کے مشکل جزیروں کی دریافت کا کام چنا ہے۔ ان کی تنقید عامیانہ انداز میں سطروں پر سطریں گھسیٹتے چلے جانے کا نہیں بلکہ علومِ انسانی میں سے تلاشِ حق کو کشید کرنے کا نام ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک اہم تنقیدی و تحقیقی مضمون ''ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت'' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اسلم انصاری کی مشرقی و مغربی علوم پر یکساں دست رس دکھائی دیتی ہے۔ دانتے کی ''طربیۂ خداوندی'' سفر ملکوت سے متعلق ہے جس میں وہ عظیم لاطینی شاعر ورجل اور اس کی محبوبہ بیاترس یا بیاتریچے کے ساتھ خیالی سفر کرتا ہے۔ دانتے

تیرھویں صدی میں روحانی اور فکری تشکیل کی ایک اہم علامت تھا۔ نظم ''طربیۂ خداوندی'' نے اسے اہم مقام عطا کیا، اس نظم کے مصرعوں کی کل تعداد چودہ ہزار دو سو تینتیس ہے۔ دانتے اپنے نظم ''طربیۂ خداوندی'' میں سب سے پہلے Limbo یعنی اعراف کی سیر کرتا ہے اس کے بعد دیگر مراحل طے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے دانتے کی ''طربیۂ خداوندی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''طربیہ ایزدی۔۔۔ڈانٹے کا نہیں۔۔۔ اٹلی کا سب سے بڑا شہ کار ہے جسے، ساری مغربی دنیا اپنا سرمایہ افتخار جانتی ہے۔ اسے مغرب کی قرون وسطیٰ کا حاصل فکر و نظر قرار دیا جاتا ہے۔ بل کہ کارلائل کے خیال میں تو ڈانٹے نے اس شاہکار کے ذریعے عیسویت کی گیارہ خاموش صدیوں کو زبان عطا کی۔''

(ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت۔ ص۹)

شیخ فریدالدین عطارؒ کی مثنوی ''منطق الطیر'' بھی ایک صوفی کے روحانی سفر کی روداد ہے جو تمثیلی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس طویل نظم میں مرکزی واقعات کے ساتھ توضیحی حکایات زیادہ بیان کی گئی ہیں سی مرغ یعنی تیس پرندے جب عشق کی سات وادیاں عبور کر کے وادی فنا میں سی مرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ وہ تیس پرندے ہی دراصل سی مرغ ہیں:

چون نگہ کردند آن سی مرغ زود
بے شک این سی مرغ آن سیمرغ بود
در تحیر جملہ سر گردان شدند
باز از نوعی دگر حیران شدند

ڈاکٹر اسلم انصاری کے بہ قول ''ان سات وادیوں کی دشواریوں سے شیخ عطارؒ خوب آگاہ کرتے ہیں لیکن وادیوں کی تفصیلات کے بیان میں ان کے ہاں زیادہ منظر نگاری یا فضا بندی نہیں ملتی۔'' اس مضمون میں مصنف نے ورجل کی منظوم داستان ''انیڈ''، ''واقعہ معراج و اسریٰ''،

ابوالعلا المعری کے رسالہ ''الغفران''، حکیم سنائی غزنوی کی ''سیر العباد الی المعاد''، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی ''فتوحاتِ مکیہ''، عبدالکریم الجیلی کی ''الانسان الکامل''، محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال''، سجاد انصاری کے ''روز جزا''، اور علامہ اقبال کی ''جاوید نامہ'' جیسی اہم تخلیقات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طویل مضمون کو ذرا سا پھیلا کر ایک اہم کتاب کی شکل دی جا سکتی تھی لیکن ڈاکٹر اسلم انصاری نے یہاں اپنے آپ کو اردو تنقید و تحقیق کے ''جبریہ'' سلسلے سے علاحدہ ثابت کیا ہے۔ یہی ان کی علمیت کی دلیل ہے۔

''ابن رشد اور اس کے افکار'' کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے مسلم اسپین کے اس نامور فلسفی اور ارسطو کے شارح کے افکار و نظریات کو اردو دان طبقے تک پہنچایا ہے۔ مصنف کے بہ قول یہ مضمون اس کے ''عہدِ جنوں'' کی یادگار ہے اور اس کی اساس اس کے ذوقِ تفلسف اور شوقِ خرد افروزی پر ہے۔ اسلم انصاری نے بڑی تفصیل کے ساتھ ابنِ رشد کے مخفی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے عہد کے جدید علما کے نظریات پر ابن رشد کی فکر کو منطبق کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری رقم طراز ہیں:

> ''اگر آج ابن رشد زندہ ہوتا تو اسلام کی علمی، عقلی اور سائنسی تشریحات پیش کرنے والوں کے بارے میں بھی اس کا رویہ وہی ہوتا جو اپنے عہد کے متکلمین کے بارے میں تھا۔ اس کے باوجود یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ابن رشد کا سارا فلسفہ مذہب صرف یہی کچھ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عالم کے قدیم ہونے، کائنات کو علت و معلول کا سلسلہ (اور معجزات کو خارج از امکان) قرار دینے اور افراد کی بقا کے عقیدے کو رد کرنے میں وہ اسلام کے علاوہ دوسرے الہامی مذاہب کے بنیادی تصورات سے بھی دور جا پڑتا ہے۔''
>
> **(ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت۔ ص۱۱۷)**

اس مضمون کے آخر میں ''منسوخ القرآن'' کے مصنف علامہ رحمت اللہ طارق کا ایک علمی شذرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

غالب اور مومن کے عہد کے ادب اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم انصاری نے بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو فنی قدر و قیمت کے لحاظ سے غالب و مومن یا شاید ذوق کی شاعری سے کچھ کم تر درجے کا ہونے کے باوجود اس لیے ممتاز قرار دیا ہے کہ اس میں تہ داری کی دو یا تین سطحیں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں بہادر شاہ ظفر اپنی شاعری میں کہیں بھی ایک ''بادشاہ'' کی حیثیت سے ظاہر نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں:

''امر واقعہ یہ ہے کہ اس عہد کے انسان کی ظاہری طور پر پرسکون اور باطنی طور پر نڈھال اور فردا سے مایوس زندگی کا سب سے معنی خیز استعادہ خود بہادر شاہ ظفر ہی ہے۔ شاہی وظیفے میں بہ تدریج تخفیف، سکوں پر ور بادشاہ کی بجائے انگریز بادشاہ کے نام کا اجرا اور ولی عہدی کے معاملات میں کمپنی کے ریزیڈنٹ کی بڑھتی ہوئی مداخلت۔ یہ سب باتیں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی تکمیل کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس لیے ظفر کی شاعری میں یاسیت حد سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کی روح اور بے بسی پر نوحہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔''

(ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت۔ ص ۱۳۵)

ایک اور مضمون ''حرف و نغمہ اور خاموشی کی مابعد الطبیعات'' میں بیدل اور غالب کے اشعار کی روشنی میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے ان دونوں لطیف چیزوں کی حقیقت کو برصغیر کے دو عظیم شعراء کے کلام کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ''غالب تخلیقی معنویت کا روشن استعارہ'' میں مرزا غالب کو ہماری شعریات ہی نہیں بلکہ فکریات میں بھی ایک اہم موڑ اور نشانِ منزل قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کا کہنا ہے کہ غالب نے اپنے منفرد شعری اسلوب کی وجہ سے ماضی اور مستقبل کے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا ہے۔ وہ انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم تہذیب کی واحد تخلیقی علامت تھے۔ ایک جگہ تبصرہ کرتے ہیں:

''جب معاشرے کا داخلی جمود ظواہر (Appearances) کی کہنگی اور فرسودگی کی صورت اختیار کر لے تو اسی کو انحطاط (Decadence) کہتے ہیں۔ وہ عناصر جو

انحطاط کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ وضعوں اور صورتوں Forms برقرار رکھنے کی سعی میں مصروف ہوتے ہیں۔ 'وضعداری' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انحطاط پذیر معاشرہ اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی ایک سعی یوں بھی کرتا ہے کہ موجود صورتوں، وضعوں اور رسموں کو ٹھہرا لینا چاہتا ہے۔ اس لیے وضعیں اور ظاہری آداب ہی اس کی آخری متاع ہوتے ہیں۔ غالب اپنی ذاتی زندگی میں کتنے ہی وضع دار کیوں نہ رہے ہوں، آخر وجودی طور پر وہ اپنے معاشرے ہی کا ایک حصہ تھے، اپنی شاعری میں وہ تغیر پسند انسان ہیں اور کہنگی تماشا کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔" (ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت، ص ۱۷۴)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے تنقیدی مطالعات میں فارسی شعر و ادب کے ایک مغربی مورخ اور نقاد پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن بھی شامل ہیں۔ یہ وہی پروفیسر براؤن ہیں جنھوں نے A Literary History of Persia لکھ کر خود کو شہرت اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن کے مفصل حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف کی ایک اور کتاب A Year amongst the Persians کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ عثمانی (ترکی) فوج میں شمولیت کی خواہش نے ای۔ جی۔ براؤن کو ترکی زبان سیکھنے پر مجبور کیا اور یہاں سے وہ عربی اور فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے براؤن کے حالاتِ زندگی پر تفصیلی تبصرے کے بعد ان کی سیاحتِ ایران اور اس کے علمی اثرات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی بہائی مت سے وابستگی اور قرۃ العین طاہرہ کے شعری افکار کو دیارِ مغرب تک پہنچانے کی کوشش کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر انھوں نے براؤن کے حوالے سے اہلِ ایران کی سرد مہری بھی بیان کی ہے:

"یہ سوال ہمیشہ میرے دل میں خلش پیدا کرتا رہا ہے کہ براؤن نے قدیم و جدید فارسی شعر و ادب کو دنیا بھر کے علمی اور ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے جو غیر معمولی

خدمات سرانجام دیں، خود اہلِ ایران نے ان کی کس حد تک تحسین کی۔ اس سوال کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی رہا ہے کہ براؤن کی جتنی قدر دانی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے یہ احساس جزوی طور پر قرین صحت ہو لیکن یہ اہلِ علم کو پیش آنے والی عمومی صورت حال بھی ہوسکتی ہے۔''

(ادبیات عالم میں سیرافلاک کی روایت۔ ص۲۰۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے محبوب شعرا میں پنڈت رگھو پتی سہائے، فراق گورکھپوری بھی ہیں۔ فراق اردو غزل میں میرؔ کے لہجے کی ایک نئے انداز سے بازیافت کرنے والے شاعر ہیں۔ اسلم انصاری کی ابتدائی غزل میں فراق کے لہجے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ فراق سے ڈاکٹر اسلم انصاری کی فکری وابستگی کی مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش ہے۔ اپنے اولین شعری مجموعے ''نیلے چاند کی رات'' (جس کا نام بھی انصاری صاحب کا تجویز کردہ ہے) کے لیے فلیپ لکھوانے کی غرض سے ایک روز جب میں اسلم انصاری کے دولت کدے پر پہنچا تو وہ کچھ مصروف تھے۔ مجھے مہمانوں کے کمرے میں بٹھا کر انہوں نے کلیاتِ فراق گورکھپوری میرے حوالے کی اور کہا کہ جب تک میں آتا ہوں آپ اسے پڑھیں۔ نوجوانوں کے لیے فراق کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے خیال میں فراق گورکھ پوری کی غزل کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ برصغیر کی خالص فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے مضمون ''فراق کی غزل'' میں لکھتے ہیں:

''سب سے اہم بات جس کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ فراق نے غزل کو خالص عجمی فضا سے آزاد کیا ہے۔ اس کی متخیلہ اور لفظی پیکر تراشی بہت حد تک برصغیر ہی سے متعلق دکھائی دیتی ہیں۔ اگر وہ کہیں دجلہ و فرات کی بات کرتا ہے تو وہ روایتاً ہوتی ہے ورنہ اُس کی شاعری میں گنگا اور جمنا کے پانیوں کی جھلک زیادہ ہے۔''

(ادبیات عالم میں سیرافلاک کی روایت۔ ص۲۸۱)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے نصب العین میں اپنے خطے کے بعض تاریخی واقعات کونسلِ نو تک

پہنچانا بھی شامل ہے۔ ایک نہایت اہم یاد ان کے پس کر یے کا حصہ ہے۔ ایمرسن کالج ملتان میں اپنے دورِ طالب علمی میں وہ پروفیسر تاج محمد خاں مرحوم سے بہت انسپائر رہے۔ انہی کی وساطت سے ایمرسن کالج کی اورینٹل سوسائٹی سے وابستہ ہوئے اور فارسی شعر کہنے لگے۔ ان دنوں میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایران کے شہرۂ آفاق محقق اور ادیب آقای سعید نفیسی، پروفیسر تاج محمد خاں کی دعوت پر ایمرسن کالج تشریف لائے۔ اسلم انصاری کالج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں شریک تھے۔ اپنے مضمون ''آقای سعید نفیسی، پروفیسر تاج محمد خاں اورینٹل سوسائٹی'' میں وہ اوراقِ گذشتہ کی کتاب کو کھولتے ہوئے ملتان کی علمی و ادبی تاریخ کے اس دن کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں جب ملک الشعرا بہار کی طرح ایران کے ایک اور دانش جو کی اس شہر میں آمد ہوئی۔ اسلم انصاری نے وہ سپاس نامہ بھی مع ترجمہ اپنے مضمون میں شامل کر دیا ہے۔ جو پروفیسر تاج محمد خان نے سعید نفیسی کی آمد پر پیش کیا تھا۔ ساتھ ساتھ انہوں نے ایک اچھے محقق کی طرح چند اور سوالات بھی اٹھائے ہیں جو آنے والے طلبہ وطالبات کو دعوتِ تحقیق دیتے ہیں:

> ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ اپریل کے دن انہوں نے ملتان میں کیسے گزارے، اس کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔ انہوں نے یقیناً ملتان کے تاریخی آثار دیکھے ہوں گے اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور حضرت ابوالفتح رکن الدینؒ کے مقابر پر بھی حاضر ہوئے ہوں گے، ممکن ہے شہر کی کسی علمی یا ادبی انجمن نے بھی انہیں مدعو کیا ہو۔ ہوسکتا ہے مرحوم آغا شیر احمد خاں خاموش کی کوششوں سے تشکیل پانے والی ملتان اکیڈمی اس وقت وجود میں آ چکی ہو اور آقای نفیسی نے اکیڈمی کے کسی اجلاس میں شرکت بھی کی ہو۔''
>
> **(ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت۔ ص۲۳۶)**

اردو شاعری کی کلاسیکی روایت میں بعض موضوعات اپنے تسلسل کی بہ دولت مختلف ادوار پر محیط ہوتے ہیں۔ ان موضوعات میں ایک کلاسیکی شعرا کا المیہ طرزِ احساس بھی ہے جس نے بطور

ایک اہم تنقیدی موضوع کے ڈاکٹر اسلم انصاری کی فکری آب یاری کی ہے۔"اردو شاعری میں المیہ تصورات" ڈاکٹر اسلم انصاری کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع ہے جوانہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں تحریر کیا۔ یہ کام تو بہت بعد میں مکمل ہوا لیکن اس کے ابتدائی خدوخال دورِ طالب علمی میں ہی اسلم انصاری کے ذہن میں ترتیب پانے شروع ہو گئے تھے۔اردو شاعری کے المیہ تصورات جیسے مختلف اوراہم موضوع سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اور پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کا خیال تھا کہ مجھے تنقید و تحقیق میں کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو میرے حوصلوں اور امنگوں اور میری صلاحیتوں کا آئینہ دار ہو۔۔۔اسی زمانے میں ایک ری سرچ اسکالرشپ مشتہر ہوا جس کے لیے بطور امیدوار انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں میں نے اپنے مجوزہ موضوعِ تحقیق کا تعین یہ کہہ کر کیا کہ میں اردو شاعری کے المیہ تصورات پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ بعد ازاں استاذی ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے لکھا کہ مجھے کسی ایسے موضوع پر کام کرنا چاہیے جسے مجموعی طور پر "روح ادب اردو" کہا جا سکے۔میں نے مودبانہ عرض کیا کہ اردو شاعری کے المیہ عناصر کا مطالعہ ایک اعتبار سے اردو ادب نہ سہی،اردو شاعری کی روح (یا اس کے غالب عناصر) کا مطالعہ ضرور ہوگا۔سید صاحب مرحوم نے ازراہِ شفقت جو وہ عموماً میرے حال پر کرتے تھے۔میری بات سے اتفاق فرمایا اور ری سرچ اسکالرشپ کے لیے میرا انتخاب عمل میں آ گیا۔لیکن بعض ناگزیر وجوہ مانع ہوئیں اور اس کام کا آغاز نہ ہو سکا۔"

(اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ ص ۱۴)

جو کام اس دور میں آغاز نہ ہو سکا بہت عرصے بعد مکمل ہوا۔اس درمیانی عرصے میں یہ موضوع ڈاکٹر اسلم انصاری کے ہاں مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا۔اور آج ایک دقیق اور علمیت سے بھرپور تحقیقی و تنقیدی کام کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہے۔

انسانی زندگی میں الم ونشاط کے بے شمار سلسلے موجود ہیں۔ بلاشبہ ہر دور کا انسان خوشی اور مسرت کے حصول میں سرگرم رہا ہے لیکن ظاہر ہے جہاں زندگی میں نشاط کے جواہر پارے ہیں وہاں غم و الم کے سنگ ریزے بھی موجود ہیں۔ حقیقت آشنا مفکرین کے مطابق انسانی زندگی کا خالص ترین پہلو المیہ ہے۔ مغربی ادب میں سوفو کلیز سے لے کر شیکسپیئر اور گوئٹے سے ٹی ایس ایلیٹ تک بھی لوگ فلسفۂ غم کی تعبیر و توجیہ کرتے رہے ہیں۔ انہی کوششوں میں ارسطو سے لے کر ہیگل، شوپن ہائر اور نطشے تک سبھی نے بہ قدر پیمانۂ ذوق اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ''شعروادب میں المیہ تصورات'' کے عنوان سے تحریر کردہ باب میں مغربی فکروادب میں المیہ تصورات کے انہی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اسلم انصاری نے مشرقی شعریات میں الم پسندی کی روایت کا مدلل مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے مصنف کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ادب پر یکساں دسترس دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی ادب میں غم والم کے فلسفے پر بحث کرنے کے بعد ایک جگہ ''وضع داری'' کے لفظ اور اس کے اطلاق کا تہذیبی مظاہر کے حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری کہتے ہیں:

''وضع'' کے لفظی معنی صورت، شکل اور ہیئت کے ہیں۔ جس کے لیے انگریزی زبان کا صرف ایک ہی لفظ یعنی Form ہے، شمالی ہند میں زوال پذیر مسلم تمدن کے حوالے سے وضع داری سے مراد یہ ہے کہ انسان جس انداز میں زندگی بسر کرتا ہو، اس انداز کو ہمیشہ قائم رکھے۔ جو لباس ایک بار پہن لے، جو وضع قطع ایک بار اس کو تادمِ زیست برقرار رکھے۔ ایک زوال پذیر تہذیب اور معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر خوبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے اندر کم از کم ظاہری صورتوں اور وضعوں کو برقرار رکھنے کی شدید خواہش پیدا ہو جائے۔ **(اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ ص ۶۵)**

اس تشریح کے تناظر میں غالب کے اس شعر کی تفہیم کی جائے تو قاری پر نئے نئے معانی کا انکشاف ممکن ہے۔ اچھلتی پگڑیوں اور لٹتی عظمتوں کے ماحول میں شرفا کا شیوہ اختیار کرنا غم پسندی

ہی کا ایک پہلو نہیں تو اور کیا ہے:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی 'وضع' کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو؟

(غالب)

''اردو شاعری میں المیہ تصورات'' کے تنقیدی مطالعے میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے میر، سودا، درد، قائم، مصحفی، جرأت، ناسخ، آتش، دیا شنکر نسیم، میر حسن، نظیر، انیس، مومن، ذوق، ظفر، غالب، حالی، اقبال اور فانی کے ہاں المیہ تصورات کے نئے معنی اور تناظرات میں کھوج پرکھ کا کام انجام دیا ہے۔ مولانا حالی کے ہاں ڈاکٹر اسلم انصاری نے غم کے اجتماعی تصور کی دریافت کی ہے۔ حالی کے ضمن میں لکھے گئے باب میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

''مولانا حالی کو قدرت نے جو وسعتِ نظر بخشی تھی۔ وہ بہت جلد ایک وسیع تر انسانی نقطہ نظر میں بدل گئی۔ جس کا فوری اثر قومی ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قومی اصلاحی اور مقصدی شاعری میں ان کا عظیم ترین فنی کارنامہ (Magnum Opus) مسدس مدو جزر اسلام ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے کچھ ایسی نظمیں تخلیق کیں جن میں بعض معاشرتی المیوں کا بیان تھا۔ اگرچہ ان المیوں میں قومی پستی کے موضوعات بھی شامل ہیں لیکن ان میں سب سے اہم انہیں طبقۂ نسواں کے دوالیے دکھائی دیے۔ جن میں سے ایک بیوہ ہو جانے والی عورتوں سے متعلق ہے اور دوسرا عورتوں کی تعلیم اور انسانی حقوق سے محرومی سے متعلق ہے۔'' (اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ ص۳۹۶)

ایک جگہ فانی بدایونی کے ہاں گہری یاسیت اور خواہش میں موجود جبلتِ مرگ پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں:

''فانی کو اردو شاعری کے دائرۂ غم کا نقطۂ تکمیل کہنا بہت بڑی تعمیم ہوگی لیکن کچھ ایسی غلط بھی نہ ہوگی۔ لیکن اس کے مقابلے میں فانی کو ایک طویل عہدِ زوال کے طرزِ احساس کا

منطقی انجام کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ لکھنوی شاعری کی وہ زوال پسندی جو نشاط پسندی کے نیچے دب گئی تھی بالآخر فانی کی شاعری میں آرزوئے مرگ بن کر ابھری اور یوں کم از کم لکھنوی شاعری کی زوال پسندی کا دائرہ فانی کی شاعری کی صورت میں مکمل ہوا۔"

(اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ ص۴۷۰)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے تنقیدی سرمائے میں ایک اہم کتاب چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف "زندگی" کا فکری و فنی مطالعہ بھی ہے۔ "زندگی" چودھری افضل حق کی ایک "زندہ" کتاب ہے۔ ان کی اس کتاب کے مختلف حصے تقریباً ہر دور میں نصاب میں داخل رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطابق جن کتب نے بچپن میں ان کے ذوق کی آب یاری کی ان میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ ان دنوں میں اس کتاب کے کچھ پیچیدہ اور خشک حصے نظر انداز کر دیے جاتے تھے اور عام فہم حصوں کو پڑھا جاتا تھا۔ لیکن تدریسی عمل کے دوران جب افضل حق کو کئی برس تک اعلیٰ ثانوی درجے کے طلبہ کو پڑھانا پڑا تو ان کی اس عہد ساز کتاب سے ڈاکٹر اسلم انصاری کا تعلق کئی سطحوں پر استوار ہوا:

"ایک معلم کی تدریسی زندگی کے کئی پہلو چھپے ہی چھپے اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ ثانوی مدارج کے اردو لازمی کے نصاب میں جب بھی "زندگی" کی کوئی کہانی شامل رہی مجھے ایک انجانی سی مسرت حاصل رہی۔ "ایک خادمِ خلق کی کہانی" اور "ایک پنجابی زمیندار کی کہانی" میں نے برسوں نصاب میں پڑھائی ہیں اور ہر بار پڑھاتے ہوئے ایک عجیب لطف محسوس کیا ہے اور ہر بار میرا ذہن "زندگی" کی ادبی اور فکری قدر و قیمت کی طرف مبذول ہو جاتا رہا ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس کتاب کے اسلوب کا تجزیہ ہونا چاہیے اور اس کے فکری مافیہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

(چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی۔ ص۸)

''زندگی'' ایک معتبر تصنیف ہے۔ ایک خاص علمی سطح کے قارئین میں اسے قبولِ عالم کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس کی فنی و فکری لطافتوں سے ایک مخصوص ذوق اور خاص مزاج کا قاری ہی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کا اس غفلت کا شکار ہونے والی تصنیف کا تجزیہ کرنا کسی کارنامے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''انصاری صاحب نے صرف 'زندگی' کے اسرار عیاں نہیں کیے بلکہ اساطیر کا مطالعہ اور اسلوب کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ تمام امور انہوں نے نہایت متین، دلکش، اور عالمانہ انداز میں انجام دیے ہیں۔ انہوں نے محض تصنیف کو اپنی تنقیدی و تحقیقی امنگوں کا محور نہیں بنایا بلکہ مصنف کی حیات اور اس کے دور کے سیاسی و سماجی حالات بھی زیرِ قلم کیے ہیں اور یوں ایک وسیع تناظر میں 'زندگی' کی معنویت اور مفہوم کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے 'زندگی' کو پیمانہ امروز و فردا سے ناپا ہے۔''

(ماہنامہ قومی زبان کراچی، ص ۸۹)

''زندگی'' کا اہم موضوع فلسفہ حیات اور خیر و شر کی مناقشت ہے۔ اس کی تصنیف میں ''منطق الطیر''، ''ڈیوائن کامیڈی'' یا ''جاوید نامہ'' کی سی ارفعیت نہ ہی لیکن سیرِ افلاک کے حوالے سے اس میں مصنف کے پیش کردہ تصورات و نظریات محض روایتی نہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''زندگی'' کے تجزیے کے دوران فنی حوالے سے بہت سے نئے پہلو متعارف کروائے ہیں۔ اور اس کے اسلوب کے سلسلے میں نثرِ مرصع کا شعری آہنگ، صوتی ہم آہنگی، رعایتِ لفظی، متوازیت یا سجع متوازن و متوازی متجانس الفاظ، واقعاتی محاکات اور نثرِ معقول، خطیبانہ آہنگ، اور مقولہ سازی کے تناظر میں نہایت عمدہ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''زندگی'' کا عالمی ادب سے موازنہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''زندگی اپنی خوبیوں کی بدولت اور خامیوں کے باوجود اردو ادب میں انفرادی مقام کی حامل ہے۔ اس کی اہمیت ادبی لحاظ سے بھی ہے اور فکری تناظر سے بھی لیکن عجیب

اتفاق ہے کہ اسے نہ فکر کی تاریخ میں اہمیت دی گئی ہے اور نہ ادب کی تاریخ میں اس کا جائزہ مقام دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ''عظیم'' نہ سہی ایک ''زندہ'' کتاب ضرور ہے اور یہی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔''

(چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی''. ص ۲۷۰)

یوں ڈاکٹر اسلم انصاری کا قلم ''زندگی'' کو نظر انداز کر دینے والوں کے لیے ''کفارہ'' بن گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی تنقید کے حوالے سے صرف ان موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو کتابی صورت میں منظر عام پر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد تنقیدی مضامین اردو کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں جن پر بحث کرنا یہاں ممکن نہیں۔ آنے والے وقت میں ان کے تنقیدی سرمائے کی مقبولیت کے حوالے سے مزید اہم پیش رفت ہونے کے توقع ہے۔

اتفاق ہے کہ اسے نہ فکر کی تاریخ میں اہمیت دی گئی ہے اور نہ ادب کی تاریخ میں اس کا جائزہ مقام دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ''عظیم'' نہ سہی ایک ''زندہ'' کتاب ضرور ہے اور یہی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔''

(چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف "زندگی". ص ۲۷۰)

یوں ڈاکٹر اسلم انصاری کا قلم ''زندگی'' کو نظر انداز کر دینے والوں کے لیے ''کفارہ'' بن گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی تنقید کے حوالے سے صرف ان موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد تنقیدی مضامین اردو کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں جن پر بحث کرنا یہاں ممکن نہیں۔ آنے والے وقت میں ان کے تنقیدی سرمائے کی مقبولیت کے حوالے سے مزید اہم پیش رفت ہونے کی توقع ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی اقبال شناسی

اردو ادب میں اقبالیات کے شعبے نے فروغ پا کر اسے اور بھی ثروت مند بنا دیا ہے۔ یہ اس لیے بھی حیران کن عمل نہیں کہ ہمارے اجتماعی کلچر پر اقبال نے مختلف زاویوں سے جو اثرات مرتب کیے ہیں ان کی تفہیم و تشریح کے لیے یہ ناگزیر تھا۔ بلاشبہ اقبال پر جو لکھا گیا اس میں تنوع موجود ہے لیکن کہیں کہیں تکرار و اعادہ کی صورتیں بھی وقوع پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کا شماران اقبال شناسوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک خاص زاویے سے فکرِ اقبال کی پرتوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالیات کے ضمن میں ان کا اثاثہ سخن نہایت جامع اور تادیر اثر انداز رہنے والا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم کتاب ''فیضانِ اقبال'' ہے۔ یہ دراصل اسلم انصاری کی ''منظوم اقبالیات'' کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اقبال کے رنگِ سخن کی نئے انداز میں تقلید کی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اس مجموعے کو شاعری کی بجائے اقبالیات کے باب میں متعارف کروایا جا رہا ہے۔ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر اسلم انصاری کی اس کاوش کو یوں بھی اعتبار اور استناد کا درجہ حاصل ہے کہ شاید اس سے قبل اس نوع کی کسی تخلیقی جستجو کا سراغ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان کے مطابق:

> ''اسلم انصاری نے اقبال کے رنگِ سخن کی تقلید کی ہے لیکن یہ تقلید دراصل ایک نئی طرز کی تشکیل ہے۔ ان کا یہ مجموعہ فکرِ اقبال کی نئی شعری تشکیلات پر مبنی ہے۔ فکرِ اقبال کی یہ شاعرانہ ترجمانی جہاں تحسین اور ستائش کا حق ادا کرتی ہے وہاں تفہیم اور تشریح کے علمی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کے بنیادی تصورات کو تخلیقی سطح پر

قبول کرتے ہوئے ایک ایسا آئینہ خانہ تعمیر کیا ہے جس میں نت نئے عکس ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔" **(ماھنامہ "قومی زبان" کراچی. ص۲۱)**

نظم گوئی میں چوں کہ تمثیلی اور نیم تمثیلی انداز اقبال کا پسندیدہ رہا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر اسلم انصاری نے اسی اسلوب کو چنا ہے۔ اس شعری تصنیف کی پہلی نظم "بیادِ مجلس اقبال" ہے۔ شاعر کے مطابق یہ ایک "منظوم ریڈیائی تشکیل" ہے۔ اس نظم میں ناقدین وشارحینِ اقبال کے افکار و تصورات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان ناقدین وشارحین میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزاندر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل شامل ہیں۔ نظم کا آغاز دو راویوں کے درمیان مکالمے سے ہوتا ہے:

راوی۱: ساز فطرت میں نوائیں تو کئی ہیں، لیکن
اپنے اسرار کو ارزاں نہیں کرتی فطرت
حجلۂ غیب میں ہر شام سنورتی ہے مگر
اپنے جلووں سے ہر اک جامِ نظر کو نہیں بھرتی فطرت

راوی۲: سالہا سال ترستی ہیں ستاروں کی نگاہیں جیسے
مدتوں یاس کے جنگل میں ہوا بھرتی ہے آہیں جیسے
سالہا سال دھڑکتی ہے دل پیکر خاکی میں تمنائے وصال
سالہا سال یونہی خاک میں ملتا ہے بہاروں کا جمال

اس مرحلے پر پورا چمن کسی "دیدہ ور" کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔ آخر میں نوائے سروش کی صدا آتی ہے اور اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم منظوم انداز میں گویا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بعد یکے بعد دیگرے ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزاندر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل کی فکر کو منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ نظم اس وقت اپنے کلائی میکس کو چھو لیتی ہے جب این میری شمل، اقبال کو "ضمیر برصغیر"

قرار دیتی ہیں۔ یہاں اسلم انصاری کی ایک نظم ''اقبال، عالم مثال میں'' کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے۔ یہ نظم اقبال اور دیگر مفکرینِ عالم کے درمیان ایک فکری اور علمی مکالمہ ہے۔ یہ خاص اسلوب میں تخلیق کردہ فنطاسیہ یا تصوریہ ہے۔ اس نظم میں اقبال کا سامنا نیٹشے، برگساں اور حافظ سے ہوتا ہے جو بڑے شائستہ انداز میں اقبال سے کچھ گلے شکوے کرتے ہیں اور اس کا جواب اقبال اپنے مخصوص قلندرانہ انداز میں دیتے ہیں۔ اس میں اندازِ سخن تو ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کا سا ہے لیکن جوش و جلال کی بجائے جمالیاتی اسلوب کو پسند کیا گیا ہے۔ اس انداز کو دیکھ کر اقبال کی میر افادی سے متعلق نظمیں یاد آ جاتی ہیں۔ ایک جگہ افلاطون کا اندازِ شکایت دیکھیے۔

مجھے ''الہی'' کہا آپ کے بزرگوں نے
مجھی سے فیض لیا آپ کے بزرگوں نے
مگر یہ آپ کہ اس درجہ مجھ سے برہم ہیں
کہ میری فکر پہ حملے ہیں اور پیہم ہیں

☆☆☆☆

اس کے جواب میں اقبال کہتے ہیں۔

''مکالمات'' و ''ریاست'' ہیں آپ کے شہ کار
کہے جاتے ہیں فکرِ صحیح کے معیار
مگر تصورِ اعیاں ہے آپ کی ایجاد
جہانِ فکر میں جس سے پڑی بنائے فساد

☆☆☆☆

منظوم اقبالیات کے سلسلے میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''جہانِ اقبال'' اور ''اقبال کا پیغام تیسری دنیا کی اقوام وملل کے نام'' جیسی شان دار نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔ تیسری دنیا کے نام پیغام میں خودی، مردِ کامل، شاہین، اقوامِ مغرب، اقوامِ مشرق، تعلیم، افراد، بادشاہی مسجد اور تہذیبِ نو

جیسی نظموں میں شاعر نے فکرِ اقبال کو آنے والے زمانوں کے لیے بھی عالمِ اسلام کے لیے حکمتِ زیست کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس انداز کی نظموں میں ایک "ساقی نامہ جدید" بھی ہے جس میں اقبال کے تصورِ خودی سے چراغِ فکر کو روشن کیا گیا ہے لیکن عہدِ حاضر کے مسائل کو وجودیت یا موجودیت کے فلسفے کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے:

نہ کیجے کسی اور شے پر قیاس
عدم پر ہے بس آدمی کی اساس
مگر جس عدم کا یہ اظہار ہے
اسی کے لیے برسرِ کار ہے
وجود و عدم کا یہ ہے امتزاج
اسے دینا پڑتا ہے اپنا خراج
خراج اپنی ہستی کا ہے "انتخاب"
ہے لمحہ بہ لمحہ یہی اضطراب
ہر اک فرد خود کو بناتا بھی ہے
مگر پھر وہ خود کو مٹاتا بھی ہے

اقبال شناسی کی روایت کے زیرِ اثر ڈاکٹر اسلم انصاری کی اہم ترین کتاب "اقبال عہد آفرین" ہے۔ اس میں شامل سترہ مضامین شعر و فکرِ اقبال کی نئے انداز میں تشریح و تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ان بہ ظاہر مختلف لیکن باہم مربوط مضامین کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم انصاری لکھتے ہیں:

"اقبال کے فکر و فن کی عظمت کے متعارف پہلوؤں کے علاوہ انہیں سے متعلق اور بھی کئی ایسے پہلو ہیں جو عام طور پر خیالِ عظمت کی تیز روشنی میں چھپے رہتے ہیں لیکن تنقیدی نقطہ نظر سے کسی طرح کم اہم نہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ اقبال کے فکر و فن کے بہت سے ایسے گوشے موجود ہیں جو اقبالیات کی روز افزوں ثروت مندی کے باوجود اقبال

کے طالب علموں اور نقادوں کے لیے دعوتِ فکر کا باعث ہیں۔''

(اقبال عہد آفریں ص ۸)

''اقبال عہد آفریں'' کا پہلا مضمون ''اقبال عہد آفریں'' ہے، اس مضمون میں ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال کو وسیع اور رچے ہوئے علمی شعور کا حامل شاعر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے علم و ادب کی زبان کو بالعموم ایک نئی تبدیلی سے روشناس کیا۔ انہوں نے اپنی لسانی تشکیل کی بنیاد محاورے اور پرانے تلازمات کی بجائے زبان کے فطری عمل پر رکھی۔ اسی وجہ سے اقبال کا فکر و فن رہتی دنیا تک حیات آفریں تصورات کا سرچشمہ رہے گا۔ اقبال اردو نظم کے ایک پورے عہد کے خالق ہیں اس کے علاوہ ان کی غزل کا انداز نئی جغرافیائی دنیا کو رنگین تخیل اور جذبہ گرم سے ساتھ پیوند کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی مصوری اور اس کی جدید تحریکوں سے بھی دلچسپی ہے۔ اس لیے فکرِ اقبال کی مصورانہ پیش کش کرنے والے رجحان ساز مصور عبدالرحمن چغتائی پر بھی ان کا ایک خوبصورت مضمون موجود ہے۔ اسلم انصاری، عبدالرحمن چغتائی کو بجا طور پر مصورِ مشرق اور بہزادِ عصر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

'' 'عملِ چغتائی' ۔۔۔ غالباً اسی ۔۔۔۔ دیدان دگر آموز، شنیدن دگر آموز ۔۔۔ کا جواب ہے۔ لیکن اسے صرف ایک نگاہِ مکرر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مصور کی اپنی تاریخ و تہذیب کے ساتھ وابستگی کی ایک شعوری تعبیر ہے۔ اس لیے مجموعی طور پر اس میں فنی پختگی کے عناصر زیادہ ہیں۔ 'مرقع چغتائی' کی طرح 'عملِ چغتائی' بھی مشرقی تمدن کی ایک خوبصورت علامت کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' (اقبال عہد آفریں ص ۳۰۴)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر سے مزین ''جاوید نامہ'' کا ایک انگریزی ترجمہ (نوبل پرائز کے حصول کے لیے) تیار کروانا اقبال کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ لیکن بوجوہ چغتائی اقبال کے معیار پر پورے نہ اتر سکے البتہ استاد اللہ بخش نے اس سلسلے میں اقبال کو کسی حد تک مطمئن کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ایک مشاق فن شناس کی طرح فرد افرداً

چغتائی کی بنائی ہوئی تصاویر کا بڑی خوبصورتی سے جائزہ بھی لیا ہے اور کہیں کہیں ان تصاویر کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ان کے منفی حصوں کی نشان دہی کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے۔

''اقبال اور عشق رسول ﷺ'' میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ سے وابستگی کا بڑے مدلل انداز میں ذکر کیا ہے۔ آں حضرت ﷺ کی تعریف و توصیف کی خواہش ہر صاحب فکر و نظر کے لیے باعثِ انبساط رہی ہے۔ آپ ﷺ کی مدح و تحسین کا سلسلہ تو ازل سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ یعنی خالقِ محمد ﷺ ہی اولین نعت گو ہے۔ اس کے بعد کا معاملہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' کی عملی تفسیر رہا ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے بڑی عقیدت کے ساتھ فکر اقبال کے اس غالب پہلو کی نشاندہی کی ہے جس کی بنیادیں آقائے نامدار ﷺ کے عشق پر استوار ہوئی ہیں۔ اقبال، اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے والہانہ شیفتگی رکھتے تھے۔ ان کا مقصد بھی ہمیشہ یہی رہا کہ ان کے افکار و خیالات میں جناب سرکار دوعالم ﷺ سے محبت و مودّت کا اظہار ہوتا رہے۔ اقبال کا عشق رسول ﷺ دیگر شعرا سے مختلف ہے کہ اس میں ہر جگہ عشق، جنوں، جذب و فراق، سوز، سرور اور کیف و مستی کی کیفیات دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری یہاں اقبال کے عشق کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اقبال کی انفرادیت اس میں نہیں کہ انہوں نے رسول اکرمؐ کی مدح کی۔ ان کی انفرادیت اس میں ہے کہ انہوں مقامِ رسالت اور ہدایتِ نبوت کو جدید علوم کی روشنی میں نفسیاتی اور فلسفیانہ توجیہات کے ساتھ عصرِ نو کے درماندہ ذہن اور شکستہ و حیران دل کے سامنے پیش کیا۔'' **(اقبال عہد آفریں ص۸۸)**

ایک مضمون میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے ابنِ خلدون اور اشپنگلر کے افکار کی روشنی میں اقبال کے تصورِ تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اقبال کے نزدیک تاریخ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انسان ہر لمحے سیکھ سکتا ہے، اس کی معنویت ایک مربوط فلسفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر

اسلم انصاری، اقبال کے نظریہ تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کا تصورِ تاریخ بہت حد تک قرآنِ کریم کے تصورِ تاریخ ہی کی تعبیر و تفسیر ہے۔ تاریخ کے بارے میں ان کا سب سے بڑا دعویٰ کہ یہ استقرائی عمل کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ قرآنِ کریم کے اصولِ تاریخ سے مستنبط ہے۔ اسے اصطلاحاً تاریخی استقراء (Historical Induction) کہہ سکتے ہیں۔ اسے منطقی استقراء (Logical Induction) کی ایک عملی صورت سمجھنا چاہیے۔''

(اقبال عہد آفریں ص ۱۲)

اسلم انصاری کا ایک مقالہ ''اقبال۔ اور احمد شاہ ابدالی'' اپنی نوعیت کا منفرد موضوع لے کر چلتا ہے۔ اقبال کی جن مسلم فرماں رواؤں کے ساتھ دلی وابستگی تھی ان میں سلطان فتح علی ٹیپو اور نادر شاہ کے ساتھ ساتھ احمد شاہ ابدالی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی دیگر سلاطین مشرق کے ساتھ زندہ رود (اقبال) کو ایک مقام بلند پر ملتا ہے۔ اس مقام پر زندہ رود (اقبال) کو اپنی فکر ناتمام اور عقل ناتمام دکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور دقت طلبی کے ساتھ اقبال کے ''ملت افغانیہ'' کے اس فعال اور تاریخ ساز بادشاہ کے ساتھ عقیدت کے رشتے کو واضح کیا ہے۔ اقبال، احمد شاہ ابدالی کو اس کے ملتِ افغانیہ کا موسس ہونے کی وجہ سے ''خسرو روشن ضمیر'' قرار دیتے ہیں۔ ابدالی کی جائے پیدائش ملتان شہر بیان کی جاتی ہے۔ میر غلام محمد غبار نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا مولد ہرات شہر قرار دیا ہے لیکن ملتان ہی کو اعتبار حاصل ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ہاں اقبالیات کے ضمن کا کردار ایک طویل مکالمے کی صورت میں اقبال کے شہرہ آفاق شعری مجموعے ''جاوید نامہ'' میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے سلطان احمد شاہ کے حوالے سے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''زندہ رود کے ساتھ اپنے طویل مکالمے کے اختتام پر ابدالی مشرق کی تقدیر کو پہلوی و نادر (رضا شاہ پہلوی اور نادر شاہ) کے عزم و حزم کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، جو عصرِ حاضر

میں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اقبال کے نقطۂ نظر سے رضا شاہ پہلوی اور نادر شاہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کے اسلامی مشرق میں مسلمانوں کے اقتدار اور سیاسی سربلندی کی علامت تھے یوں بھی ابدالی کے کردار کی نفسیات کا تقاضا تھا کہ وہ مشرق کی تقدیر کو ایران وافغانستان کے بادشاہوں کے عزم وہمت سے وابستہ کرے۔''

(اقبال عهد آفرین. ص۲۶۹)

اقبال کی ایک مختصر ترین فارسی مثنوی ''بندگی نامہ'' بھی ڈاکٹر اسلم انصاری کے لیے کشش کا سبب بنی ہے۔ اقبال پیدا تو محکوم قوم میں ہوئے لیکن ان کی روح بیدار تھی، ان کا یہی آزادانہ شعور ۱۶۸ اشعار کی اس مثنوی کی تخلیق کا سبب بنا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''بندگی نامہ'' کے چار بڑے ابواب کے موضوعات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس میں شامل ''ایک خوفناک جہنمی منظر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلم انصاری کہتے ہیں:

'' 'بندگی نامہ'۔۔۔ ۱۹۲۷ء ہی میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل لکھی گئی۔ اور 'زبورِ عجم' کے بعد اقبال کی جو شعری تصنیف شائع ہوئی وہ ان کی عظیم الشان مثنوی ' جاوید نامہ' تھی جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تین سال میں مکمل ہوئی، 'جاوید نامہ' کا سالِ اشاعت ۱۹۳۲ء ہے، گویا اس کا آغاز ۱۹۲۹ء یا ۱۹۲۸ء میں ہوا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ 'بندگی نامہ' کے فوراً بعد اقبال نے (فارسی مثنوی میں) 'جاوید نامہ' لکھنا شروع کیا ہو؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ 'جاوید نامہ' لکھنے کی فوری تحریک اقبال کی متخیلہ کو 'بندگی نامہ' کے اسی جہنمی منظر سے ہوئی ہو؟'' **(اقبال عهد آفرین. ص۱۹۱)**

ڈاکٹر اسلم انصاری کا یہ سوال نہایت معتبر اور غور طلب ہے۔ اس سے ان کی فکرِ اقبال سے وابستگی کے رشتے کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ اس جہان سے سرسری نہیں گزرے بلکہ انہوں نے کئی ریاضت بھری راتوں کے سوچ بچار کے بعد اپنے نظریات کو ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کو ایک مفکرِ تعلیم کے طور پر بھی دیکھا ہے۔ مسلم مفکرین ابن

مسکویہ، امام غزالی، ابنِ خلدون، اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے معرفتِ خداوندی کو تعلیم یا علم کا مقصدِ اولیٰ قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم کا حصول دراصل حکمتِ کاملہ کے حاصل کرنے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کی کئی نظموں اور خطوط کی مدد سے اقبال کے تصورِ تعلیم کی وضاحت کی ہے۔ اس کی تفہیم کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''اقبال کے نظریہ تعلیم کا ایک فلسفیانہ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ہمیں حقیقی اور تصوراتی کا ایک خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔ وہ حقیقی، خارجی زندگی کو رد نہیں کرتے، بلکہ اسے انسان کا میدانِ عمل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خارجی زندگی ان مقاصد عالیہ کے تابع ہوتی چلی جائے جو انسان کے شعور و ادراک میں متجلی ہوتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ تعلیم فرد کو تاریخی شعور سے اخذ نو کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تقلیدِ جامد کی بندشوں سے آزاد ہونا بھی سکھاتا ہے۔'' **(شعر و فکر اقبال ص۱۰۶)**

''اقبال اور مرزا عبدالقادر بیدل'' اور ''غالب کے حضور اقبال کا خراجِ تحسین'' میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کے بیدل اور غالب کے ساتھ موازنہ یا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال نے ادب اور زندگی کے جن پانچ بڑے معلمین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں دو مشرقی ہیں، یعنی مرزا غالب اور مرزا عبدالقادر بیدل۔ اور ان دونوں سے انہوں نے روحِ مطالب اور اندازِ بیان کی مشرقیت اخذ کی۔ یہ وہی مشرقیت ہے جو اقبال کے فکر و فن کا ایک لازمی وصف ہے۔'' **(شعر و فکر اقبال. ص۸۹)**

اقبال کے مرزا غالب اور مرزا بیدل سے فکری اشتراک کے حوالے سے یہ موضوع نیا نہیں لیکن اسلم انصاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بیدل کے ان تمام اشعار کو ایک جگہ جمع کر دیا جنہیں اقبال نے بہ طور تضمین استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اشعار کی معنویت اور غالب اور بیدل کے نظامِ فکر کا اقبال کی اساسی تصوریت سے تقابل بھی کیا گیا ہے۔

اقبال کی محبوب شخصیات میں ولیم شیکسپیئر بھی شامل ہیں، شیکسپیئر کا ذکر اقبال کی شاعری میں

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

صرف ایک جگہ ''بانگ درا'' کی ایک نظم ''شیکسپیئر'' میں آیا ہے جس کا سال تخلیق غالباً ۱۹۰۸ء ہے۔
ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنے مضمون ''اقبال اور شیکسپیئر'' میں شیکسپیئر اور اس کے فن کے حوالے سے بعض متنازعہ آرا کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اقبال کے نزدیک اسے ایک ''ذہنِ خلاق'' اور ''عظیم فن کار'' قرار دیا ہے۔ اقبال کی شیکسپیئر سے وابستگی گوئٹے کی طرز کی تو نہیں لیکن اسے نظر انداز کر دینا شاید ممکن نہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطابق اقبال کا شیکسپیئر کے ساتھ تعلق انتہائی منفرد نوعیت کا ہے:

> ''اقبال ایک اہم فکری مقدمہ قائم کرتے ہیں، یعنی حُسن، حق (حقیقتِ مطلقہ یا خدا تعالیٰ) کا آئینہ ہے، یعنی حقیقتِ مطلقہ اپنے آپ کو حسن میں ظاہر کرتی ہے (یا منعکس کرتی ہے) جب کہ اس حسن کے لیے انسان کا دل آئینہ کے فرائض ادا کرتا ہے (حق، حسن میں منعکس ہے اور حسن، دل انسان کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے) اس فکری مقدمے کی اساس پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان کے دل کے لیے شیکسپیئر کا کلام آئینے کا کام دیتا ہے۔ گویا حقیقت سے تین درجے دور (Thrice Removed from Reality) ہونے کے باوجود شیکسپیئر کا کلام حقیقت (Reality) کا آئینہ بردار یا عکس بردار ہے۔''

(شعر و فکر اقبال۔ ص ۴۰)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے یوں تو تصانیفِ اقبال اور اقبال سے متعلق تصانیف کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے لیکن ان کا فکری انسلاک اقبال کے تمثیلی اور علاماتی معنویت کے حوالے سے ان کی فارسی مثنوی ''جاوید نامہ'' سے زیادہ ہے۔ اسلم انصاری نے چونکہ سیرِ افلاک سے متعلق تخلیق کردہ نگارشات کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس لیے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کی نظر ''جاوید نامہ'' پر آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ انہوں نے اقبالیات پر اپنی آرا کو یک رخا نہیں رہنے دیا بلکہ اس کی نئی سمتیں دریافت کی ہیں۔ اقبال کے مداحین جانتے ہیں جرمنی میں اقبال کے قیام کے دنوں

میں ان کا اپنی جرمن ٹیوٹر ایماویگے ناسٹ سے دل سوزی کے جذبات پر مشتمل رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ایما کے نام اقبال کے خطوط کیٹس اور شیلے کی نظموں کے مصرعوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اسلم انصاری نے ''جاوید نامہ'' سے متعلق لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں فلکِ مریخ پر اقبال کے ایک شہر ''مرغدین'' میں پہنچنے کے سلسلے میں وہ اس شہر کے ماحول کو اقبال کے اس تصورِ حسن و جمال کے تناظر میں دیکھتے ہیں جس میں استغنا بنیادی شرط ہے:

''۔۔۔ یہاں کے لوگ بہت حد تک مغربی اقوام کا اور انجم شناس مریخی عصرِ حاضر کے (مغربی) سائنس دان کا نمونہ (Prototype) ہیں۔ یہ رصدگاہ جہاں رومی اور اقبال پہنچتے ہیں، مریخ کے ایک شہر ''مرغدین'' کے نواح میں ہے۔ اس شہر کی عمارات بلند، یہاں کے لوگ شیریں سخن، خوب رو، نرم خو اور سادہ پوش ہیں۔ اس شہر کی فضا میں اقبال کے شہرِ خواب ہائیڈل برگ کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔۔۔ کیا یہ شیریں سخن، خوب رو، نرم خو اور سادہ پوش شہر۔۔۔ جرمنی میں اقبال کی ٹیوٹر ایماویگے ناسٹ کی تعمیم نہیں؟'' (شعروفکر اقبال ص ۷۸)

اقبال کی شاعری چونکہ عظمت کے لحاظ سے مسلم الثبوت ہونے اور فکری، اصلاحی اور اخلاقی جہتوں کے سبب رجائیت کی علم بردار ہے۔ وہ تحرک کے قائل ہیں اور خود آگاہی اور خود شعوری کے عمل میں زندگی کے تلخ و شیریں کا ادراک رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اقبال کے ہاں زندگی کے المیہ پہلوؤں کا شعور و ادراک بھی دریافت کیا ہے۔ ان کے مطابق اقبال کے ہاں المیہ عناصر کی مختلف اور منفرد تعبیر ملتی ہے۔ شعری روایات کے زیرِ اثر ''آہِ سرد'' اقبال کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اور اقبال نے شعوری طور پر غم کو ایک ایسی سطح پر قبول کیا ہے جہاں یہ زندگی کے باطن کو اور بھی تاب دار کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال کے فلسفۂ غم کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شکوہ لکھتے ہوئے اقبال کے اندر سے ایک اور اقبال برآمد ہوا

جس نے جذباتِ غم کی قلبِ مائیت کے عمل کو ایک واضح صورت عطا کی۔ یہ واضح صورت بانگِ درا کی پہلی طویل نظم 'شمع اور شاعر' کے فکری اور معنوی مواد میں ظاہر ہوئی۔ یہ نظم ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں اگر شاعر سے مراد خود اقبال ہیں تو شمع بھی خود انہیں کی ذات کی ایک علاماتی تشکیل ہے۔ شمع کی روشنی، اس کا جلنا اور پگھلنا شاعر کی اپنی ذات کا استعارہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے بجا طور پر شاعر کی انائے ثنیٰ (Alter-ego) بھی قرار دیا جاسکتا ہے جو شاعر کو اس کا حقیقی منصب یاد دلا رہی ہے۔ اس نظم میں حزنیہ لے نمایاں ہے۔''

(اردو شاعری میں المیہ تصورات۔ ص۴۳۹)

ڈاکٹر اسلم انصاری نے بطور شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات اپنے مزاج کی جمالیاتی کیفیت تخلیقی پس منظر، عالمانہ نقطہ نظر کی بنیاد پر خود کو علمی، ادبی اور تہذیبی دنیا میں بھرپور انداز سے متعارف کروایا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا پھیلاؤ اس قدر زیادہ ہے کہ بقول مختار ظفر:

''یہاں تحقیق، تنقید اور تخلیق کے مختلف رنگ حسن تناسب سے ہم رنگ ہو گئے ہیں جس سے یہ موضوعات امید ہے کہ 'فروغِ رنگِ گل کا استعارہ' بنیں گے۔''

اپنے مطالعۂ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم انصاری نے نئے راستے متعین ہیں۔ ان کا یہ سفر جاری وساری ہے اور توقع کی جانی چاہیے کہ ابھی اقبال شناسی کے کئی اور در واہوں گے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی ادبی کالم نگاری

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شناخت کا مضبوط حوالہ تو شاعری اور تنقید ہی ہے لیکن انہوں نے ادبی، فکری اور تہذیبی کالم بھی تحریر کیے ہیں۔ کالم ایک ایسی صنف ہے جس میں مستقل عنوان کے تحت کالم نگار حالات و واقعات کا صحیح مرقع کھینچتا ہے۔ ایک ادبی کالم اپنے موضوع اور اسلوب کی بدولت عام کالم سے مختلف ہوتا ہے۔ اپنے ادبی محاسن کی بنا پر اسے صحافتی تحریر کی بجائے ادبی نگارش کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان کے مطابق:

''ادبی کالم سے مراد اخبار میں شائع ہونے والی وہ بے ساختہ تحریر ہے جس کا موضوع سراسر ادبی ہو۔ ظاہر ہے کہ موضوع کے ساتھ ساتھ اس کا اسلوب بھی ادیبانہ ہونا چاہیے۔ ادبی اسلوب اور ادبی موضوع کے امتزاج و اشتراک سے جو تحریریں وجود میں آتی ہیں انہیں صحافت کا نہیں ادب کا حصہ شمار کرنا چاہیے۔'' (خامہ بگوش۔ ایک مطالعہ ص ۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے ادبی کالموں کا مجموعہ ''تکلمات'' کے نام سے منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں توقیر حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعے میں مختلف ادبی، تہذیبی اور فکری موضوعات پر خوبصورت کالم شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری بھی ان کالموں کو محض صحافتی کالم نہیں سمجھتے۔ ان ادبی فن پاروں کی تخلیق کا محرک Barren Period یعنی ادبی یا شعری بانجھ پن تو نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں ایک نئی کہانی ہے، جو خود اسلم انصاری کی زبانی سنیے، کہتے ہیں:

''کچھ عرصہ پہلے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی (ملتان) کے ایم اے اردو کے ایک طالب علم نے کچھ منتخب شعرا کی نظریات، حیات اور تصورات فن پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی غرض سے

ایک مفصل سوال نامہ مرتب کیا اور اس کی نقل مجھے بھی عطا کی کہ ان کے جوابات تحریری یا زبانی طور پر دوں۔ یہ سوال نامہ کچھ ایسے بنیادی اور خیالات انگیز سوالات پر مشتمل تھا کہ میں نے اس سے تحریک پا کر اپنے جوابات کو تحریری صورت میں دینے کا فیصلہ کیا اور ہر سوال کا ایک مفصل جواب لکھ ڈالا۔'' (**تکلمات۔ ص۸**)

بعض دوستوں کی مشاورت اور عمومی افادیت کے پیش نظر یہ نثر پارے بعد میں ایک قومی روزنامے کے ادبی صفحے میں ''مکالمے'' کے نام سے سلسلہ وار شائع ہوئے اور قارئین کے ایک وسیع حلقے کی داد وتحسین کے مستحق بنے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کے ادبی کالم کا موضوع زندگی، قسمت یا تقدیر، محبت، انسانیت کی اعلیٰ اقدار، شاعری، ادب، مشاعرہ، استاد شاگرد کا رشتہ، معلم و مرشد، شہر بڑا کہ آدمی؟، تاریخ، خودنوشت، کلاسیکیت اور رومانویت وغیرہ ہیں۔ یہ موضوعات ان کے افکار ونظریات کا آئینہ ہیں۔ انہوں نے بڑے دھیمے انداز میں ہماری اقدار کے معدوم ہونے کا مرثیہ لکھا ہے۔ اسلم انصاری کا مختلف تصورات پر بڑا واضح نقطہ نظر ہے۔ مشاعرے کی روایت کو ہی لے لیں۔ دورِ رفتہ میں مشاعرے کی بساط عشاق کے لیے رندی اور عاشقی کے اڑن کھٹولے کا کام دیتی تھی۔ مشاعرہ گاہ میں لگے پردے کے دوسری طرف خواتین بھی براجمان ہوتیں، دوسری طرف ان کی موجودگی کا احساس حاضرین کے لیے ایک عجیب سی سرشاری کا باعث بنتا، اس قسم کی محافل میں ڈیرہ دار طوائفیں بھی بڑے دھڑلے سے آن کر بیٹھ جاتی تھیں۔ عشق کا کاروبار انہی کی بدولت چلتا تھا۔ اسی زمانے کی کسی گھریلو شاعرہ کا شعر ہے:

عشق کا حال بیسوا جانیں
ہم بہو، بیٹیاں یہ کیا جانیں

سامعین مشاعرہ کے مجمع میں بیٹھا، ہر شخص اپنے اپنے دکھوں کے جلو میں تخیل کی وادی سے گزرتا تھا۔ غزل گو شعرا سالک اور پیر و مرشد کا دعویٰ کیے بغیر اپنے شعری موضوعات سے اس کی

''تالیف قلب'' کا اہتمام کرتے تھے۔مشاعرہ زوال پذیر ہوا تو پوری ہندستانی مسلم تہذیب زنگ آلود ہوئی۔اسلم انصاری کے خیال میں مشاعرہ برصغیر کی زوال پذیر مسلم تہذیب (مغل تہذیب) کا عطا کردہ تحفہ ہے۔انہوں نے اس کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:

''مشاعرہ دربار اور بزمِ نشاط کا نقطۂ اتصال بھی تھا اور دونوں کا بدل بھی علامتی طور پر یہ زبان اور تہذیب دونوں کا 'ایوانِ عدل' تھا۔ اس اعتبار سے مشاعرہ ملوکیت سے جمہوریت کی طرف سفر کا ایک شعری سفرنامہ تھا جس میں 'میر مجلس' کی حیثیت علامتی سربراہ کی ہوتی تھی اور شاعر اور سامعین میں داد و بے داد کا جمہوری رشتہ قائم رہتا تھا۔ دربار کے آداب اور مشاعرے کے آداب میں کچھ ایسا فرق بھی نہ تھا۔زبان اور تہذیب دونوں مقامات پر غیر معمولی اہمیت کی حامل تھیں۔محاورے کو دونوں جگہوں پر اہمیت حاصل تھی۔شاعر دربار میں بھی اہم تھا،مشاعرے میں تو تھا ہی۔'' (تکلمات۔ص ۵۸)

عالمی ادب کی تاریخ میں دنیا کی اولین سوانح عمریاں قدیم چین میں سسو ما چین (۲۰۰ق م) اور اس کے ہم عصر لیوسیا نگ کی تصنیف کردہ ہیں۔تقریباً اسی عہد میں یونانی مورخ زینوفن (Xenophon) کی سوانح عمری بھی مقبول ہوئی۔یورپ میں غالباً پلوٹارک کی سوانح عمری Parallel Lives اولین سمجھی جاتی ہے۔سوانح عمری یا خودنوشت سوانح عمری ایک مکمل تاریخ ہے جو کسی انسان کے آغاز سے انجام تک کے سفر کی روداد کو بیان کرتی ہے۔ ہر قسم کی سوانح عمری ایک مشکل اور دقیق فن ہے۔اس میں بیک وقت تاریخی شعور، ناول کی وسعت،شعری میلانات،تخلیقیت سے بھرپور جامعیت اور محقق کی سی جستجو کا ہونا لازمی ہے۔ خودنوشت سوانح عمری پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا دارومدار چوں کہ حافظے،یادداشت یا خطوط پر ہوتا ہے اس لیے اس کی تہ سے سچ کا نکلنا شاید ناممکن ہے۔مسز آر مارونبسن نے خودنوشت کو ایک ناکام صنف کہا ہے۔ان کے مطابق اس میں مبالغہ آرائی اور ملمع سازی زیادہ ہوتی ہے،اکثر خودنوشت سوانح عمریوں میں نمود و نمائش کا پہلو نمایاں ہے۔اپنی شخصیت کو مقامِ معلیٰ پر لے جانا اور دوسروں

کوتحت الثریٰ تک پہنچا دینا خودنوشت لکھنے والے کا مقصد سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے اس حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا ہے:

''خودنوشت سوانح عمری میں سب سے اہم سوال اس کی صداقت کا ہے۔اس سلسلے میں جو شکوک وشبہات سوانح عمری، بلکہ خود تاریخ پر بھی وارد ہوتے ہیں، خودنوشت سوانح عمری پر بھی وارد ہو سکتے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ اگر الف کے بارے میں ب کی لکھی ہوئی بات درست تصور کی جا سکتی ہے تو الف کی بات خود اپنے بارے میں درست کیوں نہیں قرار پا سکتی۔جس تنقیدی شعور (درایت) کو ہم تاریخ اور سوانح عمری کے مطالعے میں کام لاتے ہیں، اسی تنقیدی شعور سے ہم خودنوشت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں بہر حال کذب کا احتمال تو مؤرخ اور سوانح نگار پر بھی ہے۔۔۔اس میں شک نہیں کہ بعض لوگوں نے خودنوشت سوانح عمری کو علمی اور تاریخی دجل وفریب کا ذریعہ بنایا ہے، لیکن یہ جرم بعض تاریخ دانوں نے بھی کیا ہے۔'' (تکلمات ص ۸۲)

بعض فلسفیانہ موضوعات بھی ڈاکٹر اسلم انصاری کے کالموں کا موضوع بنے ہیں۔مثلاً انسانی زندگی میں سال، صدی اور ہزاری (وقت) کا تصور نہایت پراسرار ہے۔صدی کو ہی لے لیں اور غور کریں کہ سیاسی لحاظ سے کیا برصغیر کے عوام کی بیسویں صدی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا تھا؟ اس کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے تو نہیں ہو گیا تھا؟ اسی طرح کیا اکیسویں صدی نے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں اپنے وجود کو نہیں منوایا جب انسان نے خلا کو تسخیر کرتے ہوئے چاند پر پہلا قدم رکھا۔خود بیسویں صدی، انیسویں صدی کے وسط ہی میں پیدا ہو گئی تھی جب ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے بیسویں صدی کے فکری راستوں کا تعین کیا۔۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون کی شہرہ آفاق کتاب Origin of Species منظر عام پر آئی، انھی دنوں میں تیل کے پہلے ذخیرے کو قابلِ استعمال بنانے کی سعی کی گئی۔کیا ڈارون کا انیسویں صدی کے تیقن پر بھاری چوٹ لگانا اور تیل کے پہلے کنویں کا آئندہ کی انسانی ترقی کے لیے مواد فراہم کرنا، نئی صدی کا

طلوع نہ تھا؟ ادھر ہم ہیں کہ اعداد وشمار کی مدد سے سالوں، صدیوں اور قرنوں کا تعین کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت اور اس کے ثبات وتغیر کی کوئی سائنسی توجیہ ممکن نہیں۔ وقت کی ہواؤں کا رخ نہ جانے کس دیس کو ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

دلیلِ کم نظری، قصۂ قدیم و جدید

وقت کے اسی پراسرار پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری نے بڑے دلچسپ انداز میں متعلقہ سوال اٹھایا ہے۔ کہتے ہیں:

سال، صدی یا ہزاری کا تعین محض اضافی ہے، یعنی ہمارے ہی متعین کیے ہوئے تاریخ کے کسی خاص لمحے یا واقعے سے لے کر اب تک ماہ وسال کی کتنی گردشیں وجود میں آچکی ہیں یا بہار وخزاں کے کتنے دور بیت چکے ہیں، زمانہ قدیم کا انسان سال کا تعین موسموں کی آمد ورفت سے ہی کیا کرتا ہوگا، پھر کسی خاص واقعے کو نقطۂ آغاز مان کر سالوں کی تعداد میں اضافہ کرتا رہا۔ لیکن وقت کے اس اضافی تصور کے ذریعے ہی انسانی ذہن، تاریخ کے ادوار کا تعین کرتا ہے تو کیا عجیب بات نہیں کہ چند روز پہلے تک جو بات ایک ماہ پرانی تھی، ۲۰۰۰ء کی ابتدا ہوتے ہی وہ گذشتہ سال ہی کی نہیں گذشتہ صدی کی بات ہوگی۔''

(تکلمات ص۱۱۱)

ژاں پال سارتر کا شمار بیسویں صدی میں وجودیت کے فلسفے کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ھائیڈیگر، گیب رل مارسل اور کارل یسپر بھی قدرے (سیکولر وجودیت یا عیسائی وجودیت کی تفریق کے ساتھ) قابل ذکر نام ہیں۔ سارتر کے خیال میں وجودیت کے فلسفے کے ساتھ انسان کی بے چارگی اور نا امیدی کا تصور بھی وابستہ ہے۔ انسانی فطرت نام کی کوئی شے نہیں۔ انسان کرب کے عالم میں ہے اور اس کے کرب کی نوعیت ذمہ دار افراد سمجھتے ہیں۔ انسان کی سزا یہی ہے کہ وہ آزاد ہے، سزا ان معنی میں کہ اس نے اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا پھر بھی وہ

آزاد ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ڈال دی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر وجودیت کی تحریک مظہریت کی تحریک سے منکشف ہوئی ہے۔ ادب کے طالب علموں کے لیے وجودیت یا مظہریت کی اساسی نوعیت کو سمجھنا نہایت مشکل ہے، اس کے ادبی اثرات بھی مشرقی اور مغربی فلسفہ وجودیت کے باوجود سمجھ میں نہیں آپاتے، ڈاکٹر اسلم انصاری کا چونکہ عالمی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ اس لیے جدید مغرب کے فکری رجحانات اور نظری میلانات پر ان کی کامل دسترس ہے۔ ژاں پال سارتر، اسلم انصاری کے مطالعے کا خصوصی جزو ہے، ایک جگہ پر ''انسان بڑا کہ شہر؟'' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اسلم انصاری فرانس کے عالمی شہرت یافتہ مفکر کے قدوقامت کا یوں تعین کرتے ہیں:

''اب سے کوئی اڑھائی عشرے پہلے فرانس کے صدر ڈیگال نے کہا تھا، سارتر فرانس ہے، میں اسے کیسے گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن سارتر فرانس تو کیا پورے یورپ سے بھی بڑا نکلا۔ آج اسے دنیا میں وجودی فکر کے نقطۂ عروج کے طور پر ہی نہیں مغرب کے آخری مفکر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گویا ملک اور آدمی یا شہر اور آدمی کے کمپیٹیشن میں اہم فیکٹر آدمی ہے۔ آدمی کی داخلی وسعت کے بارے میں اس سے بڑا شاہد عدل کون ہوسکتا ہے۔''

(تکلمات ص ۶۸)

جدید یورپ میں ژاں پال سارتر کی جگہ اب میلان کنڈیرا اور بورخیس نے لے لی ہے لیکن ڈاکٹر اسلم انصاری کے خیال میں ان کی ادبی قامتیں سارتر سے بلند نہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری انسانی شخصیت کی تعمیر اور ارتقا میں استاد کے مشفقانہ کردار کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اگرچہ اس بات کے سبھی قائل ہیں اور عمومی طور پر اس کے دلائل بھی ان کے پاس ہیں لیکن اسلم انصاری اس حوالے سے تجربہ پور رائے رکھتے ہیں۔ ''استاد اور شاگرد کا رشتہ'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

''شاگرد، احترامِ استاد کے بغیر استاد کے فیضانِ نظر سے محروم رہتا ہے، اسی طرح استاد

بھی شاگردوں کے لیے عمومی شفقت کے رویے کے بغیر اس روحانی لذت اور قلبی راحت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا جو پڑھانے کے عمل کا لازمی ثمرہ ہوا کرتا ہے۔ معلم اور متعلم کے معدوم ہوتے ہوئے رشتوں کی بحالی کی صورت یہی ہے کہ شفقت اور احترام کے دوطرفہ توازن کو بحال کیا جائے۔'' (تکلمات۔ ص ۶۱)

اسی طرح ''معلم اور مرشد'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں دونوں کے مابین فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اسلم انصاری یوں گویا ہوتے ہیں:

''دیکھا جائے تو معلم، مرشد اور مرشد، معلم ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اصطلاحی مرشد کا دائرہ تعلیم و تربیت اپنے مسترشدین (مریدین) کی اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی تک محدود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے معلم ایک عمومی تصور اور مرشد اس کی ایک خاص صورت ہے۔'' (تکلمات۔ ص ۷۶)

خود ڈاکٹر اسلم انصاری کی فکری جہتوں کے تعین میں علامہ اقبال مرشد کے طور پر کارفرما دکھائی دیتے ہیں جب کہ اساتذہ بے شمار ہیں۔ ان اہم اساتذہ میں ایک نام سید علی عباس جلالپوری کا بھی ہے جو ایمرسن کالج ملتان کے دورِ طالب علمی میں اسلم انصاری کے استاد تھے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر تاج محمد خان اور ملک بشیر الرحمٰن کے بعد جن اساتذہ کے علم و فضل نے انہیں متاثر کیا ان میں علی عباس جلالپوری سرفہرست ہیں۔ ''سید علی عباس جلالپوری: ایک یاد'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں ان کا پس کر یہ (Nostailgia) عود کر آتا ہے، اور کالم میں علی عباس جلال پوری اپنی تمام تر فلسفیانہ تھیوری کے ساتھ آن کھڑے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی، رت جگے سے سوجی آنکھوں والے علی عباس جلالپوری سے ذرا تعارف ہو جائے:

''۔۔۔کلاس روم میں علی عباس صاحب کے حضور ہم بہت دیر سے آئے۔ پہلے دن انہوں نے ہمیں دیوانِ غالب کی ردیف 'ی' کی یہ غزل پڑھائی:

سر گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

فلسفے کا پس منظر رکھنے والے استاد کے لیے غالب کی غزل کی تدریس کچھ اور ہی معنی رکھتی ہے۔ سید صاحب نے ہمیں یہ غزل کچھ اس انداز سے پڑھائی کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ادب اور شاعری کی تدریس میں پہلی بار جدید نفسیات اور فلسفے کی اصطلاحات کا استعمال ہمارے لیے حیرت کا باعث بھی تھا اور انشراحِ خاطر کا سبب بھی۔'' (تکلمات. ص ۱۰۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کا ''متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکنا'' یوں بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ''تکلمات'' کے چند کالموں کے موضوعات میں سید علی عباس جلالپوری کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً:

- ☆ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی تشکیل میں محبت کا کردار (اسلم انصاری)
- ☆ یہ کہ عشق ایک مرض ہے (علی عباس جلالپوری)
- ☆ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے (اسلم انصاری)
- ☆ یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے (علی عباس جلالپوری)

انسانی قدروں کی ارفعیت کو تشکیل دینے میں محبت کے کردار پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری اس والہانہ جذبے کو انسان کی اکمل صورت گری کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ محبت کو محض ارضی حوالے سے دیکھنے کی بجائے اس کے آفاقی جذبوں کی عِفت اور عصمت کے داعی ہیں۔ محبت کی تعریف کرتے ہوئے یہاں اسلم انصاری کا اسلوبِ تحریر بھی دیکھنے کے لائق ہے:

''محبت کا چراغ خواہ ٹمٹماتا ہی رہے، زمین کے کسی نہ کسی حصے کو روشن ضرور کیے رکھتا ہے، محبت ہی وہ شمع ہے کہ جب تک قانون کے الفاظ کو منور نہ کردے انصاف کا چہرہ نہیں دکھائی دیتا۔۔۔ محبت ہی وہ الوہی نغمہ ہے جس کی گونج میں شامل ہوئے بغیر نہ آپ کوئی

زندہ رہنے والا گیت تخلیق کر سکتے ہیں نہ وہ لہجہ وجود میں لا سکتے ہیں جو انسانی گفتگو میں شاعری کا لازوال سرچشمہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی خود محبت ہی ہے جو ہمیں مجازی یا صنفی محبت کی دنیا سے بالاتر کر کے محبت کے آفاقی دائروں میں لے جاتی ہے، کیونکہ محبت کا کام خود محبت ہی کر سکتی ہے۔ یہ انسانیت کی مصوری، اور زندگی کی شاعری ہے، اس لیے دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی۔''(**تکلمات ص۸۹**)

یہ بھی بہت بڑی حقیقت ہے کہ ماضی ہمارے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ انسان کا ایک انتہا پسندی سے دوسری انتہا پسندی کی جانب بڑھنا فطری ہے۔ ماضی کی یادداشتیں، آثار و عمارات، نوادرات، اشیا اور افکار و نظریات تمدنی تسلسل کے لیے ضروری ہیں۔ اسی لیے تو انسان اپنے رد کردہ اشیا کو بھی عجائب گھروں کی زینت بناتا ہے۔ انیسویں صدی میں ثبوتیت پسندوں (Positivists) کے دیے جانے والے نظریے کے مطابق واقعات کی تہ میں کارفرما قوانین کی شناخت کی جائے تو عقدہ کھلتا ہے۔ انسانی معاشرے میں ارتقا کے اصولوں کو اسی وقت سے پیش نظر رکھ لیا گیا تھا۔ ایک عام سا یہ تصور کہ ''کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟'' شاید ایک محاوراتی اندازِ بیان کے سوا کچھ نہیں۔ آپ ایک ہوا میں دو مرتبہ سانس نہیں لے سکتے، ہر بار نئی ہوا ہوگی۔ آپ ہر روز نئی شان سے طلوع ہونے والے سورج کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور اگر گردن میں کجی نہیں تو براہِ راست چاند کی کرنوں کی کُن مُن سے ہر شب نیا لطف و کرم بھی سمیٹ سکتے ہیں۔ اسلم انصاری نے صوفیائے کرام کے تصور ''تجلی کو تکرار نہیں'' کے حوالے سے آیہ کریمہ ''کل یوم ہو فی شان'' سے استفادہ کرتے ہوئے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''کون کہہ سکتا ہے کہ اس بہار میں جو پھول کھلے ہیں، یہ ہو بہ ہو اور مو بہ مو وہی ہیں جو پچھلے سال اور اس سے پچھلے سالوں میں نظر افروز ہوئے تھے۔ یا اب کے موسم بہار میں جو گھن گھور گھٹائیں چھائیں گی وہ عین بین پچھلے سالوں والی گھٹائیں ہوں گی۔ ایسا ممکن نہیں، اور کوئی عاقل اس کو یوں تصور بھی نہیں کرتا، صورتوں کے تحول اور اصول اظہار کی

کارفرمائی میں مشابہت ضروری ہے لیکن ایک واقعہ، ایک مظہر دوسرے واقعے یا مظہر کا عین (Identical) نہیں ہوتا۔'' (تکلمات۔ ص۱۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی ''کالمانہ نثر'' مکمل ادبی شان رکھتی ہے، جاوید اصغر کے خیال میں یہ ادبی کالم ایک نئے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں:

''ان کالموں کی ادبی قدر و قیمت مسلمہ ہے اور جن کا معیار روزمرہ کالم نویسی سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ اسلم ایک مفکر، دانشور فلسفی، ماہر نفسیات، معلم اور ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کا انداز تکلم عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔۔۔ بعض کالم تو انشائیے کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔'' (گفتگو کا چراغ۔ ص۱۱۲)

ان کالموں کو انشائیہ کہہ دینا تو شاید درست نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ انشائیے میں موجود معنویت پر جمالیاتی رنگ کا غلبہ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ہاں ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہی اسلوب ڈاکٹر اسلم انصاری کی نثر کو دوسروں سے جدا بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی یہ رائے زیادہ معتبر دکھائی دیتی ہے:

''عموماً کالم نگاری کو علمی ادبی درجہ نہیں دیا جاتا، اسے وقتی اور عارضی میلانات کا ترجمان خیال کیا جاتا ہے۔ انصاری صاحب نے خالص علمی و ادبی موضوعات پر نہایت خوبصورت توضیحی زبان میں کالم تحریر کیے۔ ان میں انہوں نے ادب اور زندگی کے نہایت اچھوتے اور بے حد اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کالم ایک مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں اور انصاری صاحب کے علمی و ادبی تصورات کے ایک منفرد رخ کو اجاگر کرتے ہیں۔'' (گفتگو کا چراغ۔ ص۱۱)

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ادبی کالم اپنے خوبصورت اسلوب، علمی شان اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے علمی و ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کالموں میں متعارف کرائے گئے موضوعات اور ان کی مفصل تشریح میں ایک بالغ نظر انسان کو چونکا دینے کی

بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ ان ''افکار عالیہ'' کی قدر و قیمت کا صحیح تعین شاید آنے والے وقت میں ہو۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے بہت کم تعداد میں کالم لکھے ہیں اگر وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں تو شاید اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوع کی ایک اور ''غبار خاطر'' کا اضافہ ہو جائے۔

ناقدین کی آرا

پروفیسر انصاری نے علامہ اقبال سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ جو مثنوی (چراغ لالہ) میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئے ہیں اور اقبال ہی کی طرح اس مثنوی کے مصنف نے بھی مثنوی میں اپنی اور دوسرے شاعروں کی غزلیات کو بکھیر دیا ہے۔ یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ ان دوسرے شاعروں میں مرزا بیدل بھی شامل ہیں جنہیں اقبال اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ اس مقام پر مسٹر انصاری کی مثنوی کے ان تمام مشتملات کو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ جو کہ جدید زندگی کے موضوعات کو زیر بحث لاتی ہے اور ان معاصرین پر نکتہ چینی کرتی ہے جو اپنے آپ کو سکون محض اور مرگ آفریں جدید فنون میں گم کر دیتے ہیں۔ یہ مثنوی نسل نو کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ تابناک ماضی میں پیوست اپنی جڑوں کی طرف رجوع کرے تا کہ ماضی سے ایک مثبت مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

(ڈاکٹر این میری شمل مشمولہ ''چراغ لالہ'')

اسلم انصاری کا اسلوب تحریر ادبیت اور علمیت کے بہترین اجزا سے ترکیب پاتا ہے۔ خالص علمی اور فلسفیانہ مباحث میں بھی انہوں نے اپنی تحریر کو گنجلک نہیں ہونے دیا۔ اور ہر موضوع و مضمون میں اسلوب کی دل کشی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

(جسٹس (ر) جاوید اقبال مشمولہ اقبال عہد آفریں)

اقبال شناس ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا خود اقبال ہونا۔ اور کسی بھی اقبال شناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے علمی اور فکری سفر کے دوران وہ سب 'ہفت خواں' طے کرے جو کہ اقبال

نے اقبال بننے کے لیے طے کیے تھے۔ پروفیسر اسلم انصاری ان معدودے چند اقبال شناسوں میں سے ہیں جو اس علمی منصب سے عہدہ براہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب پہ کامل دست گاہ رکھتے ہیں۔ جو اقبال شناسی کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے پروفیسر اسلم انصاری کا اشہب قلم ادب، فلسفہ، تاریخ ثقافت، علوم انسانی اور فنون لطیفہ جیسے میدانوں میں اکثر اپنی جولانیاں دکھاتا رہا ہے جو خود اقبال کے مخصوص میدان رہ چکے ہیں۔''

(ڈاکٹر آفتاب اصغر مشمولہ اقبال عهد آفریں)

ہر اہم شاعر کی طرح اسلم انصاری بھی اپنے عہد کی (ذاتی اور اجتماعی) صداقتوں کا شاعر ہے۔ مگر قدرت نے اسے صداقت کے شعری اظہار کا ایسا بے نظیر سلیقہ ودیعت کر رکھا ہے کہ اس عہد کی صداقت اس کی شاعری میں منتقل ہو کر ہر عہد کی صداقت قرار پاتی ہے۔ دراصل وہ لمحہ موجود یا لمحہ گزراں کو ماضی کی روایات اور مستقبل کے امکانات سے مربوط کر کے تخلیق شعر کرتا ہے۔ جب اس عہد کی جدید امیجری، جدید علامتیں اور جدید استعارے، اسلم کی گہری عصری بصیرت اور آفاق گیر تفکر کے حوالے سے اس کے شعر میں وارد ہوتے ہیں تو اظہار وابلاغ اور رنگ و آہنگ اور معنی و مفہوم کا وہ معجزہ تشکیل پذیر ہوتا ہے جس کا نام ''خواب و آگہی'' ہے۔

(احمد ندیم قاسمی۔ مشموله۔ خواب وآگهی)

''خواب و آگہی'' میں ہر لفظ ایک موج ہے جو ادراک حقیقت کے بحر بے کراں سے تعلق رکھتی ہے۔ نظم میں ہر موج وقتی طور پر مٹ کر ایک نئی موج کو جنم دیتی ہے اور سلسلۂ تموج اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ساحلِ معنی تک رسائی نہیں ہو جاتی۔ خواب و آگہی کا شاعر وہ آرٹسٹ ہے جو سوز سے ساز اور خاموشی سے آواز پیدا کرتا ہے۔ وہ جلتے ہوئے عہدِ انسانی کا خاموش تماشائی نہیں بل کہ اس آگ کے شعلے اس کے دامن کے قریب سے ہو کر گزرتے ہیں اور اس کے جمال آفریں آہنگ میں بدل کر شعور کے بے بہا اور بے شمار نقطوں کی تخلیق کرتے ہیں۔

(جابر علی سید۔ مشموله ''خواب و آگهی'')

اسلم انصاری کی شاعری خواب جمع آگہی کا حسین مرکب ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے خواب کی سی رومانی کیفیت اور آگہی کی رنگا رنگ کرنیں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اس کے ہاں محض خواب نہیں کہ دیکھنے والا خیال کی گم گشتہ اور نادیدہ وادیوں میں بھٹکتا پھرے اور نہ ہی اس کے ہاں آگہی کی تیز اور نظروں کو خیرہ کرنے والی روشنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلم انصاری خواب کی دھندلی فضا اور آگہی کے آشوب میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ خیال ونظر کی روشن اور شاداب وادی میں محوِ خرام رہتا ہے اسلم کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں کہیں ناصر کاظمی کے طرز احساس کا پرتو نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ابتدائی غزل میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک نئے تجربے کی راہ پر قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ اردو غزل میں حسن وعشق کا بیان ہمیشہ واردات اور کیفیات کے حوالے سے آیا ہے۔ ہمارے غزل گو شعرا نے عشق ومحبت کے واقعاتی پہلوؤں کو غزل میں سمونے کی طرف توجہ نہیں دی۔ غزل کے مخصوص شعری آہنگ اور لب ولہجہ میں واقعاتی پہلو یقیناً بہت مشکل ہے، کیونکہ غزل کا ایجاز بیان، ایمائیت اور تغزل اس کی اجازت نہیں دیتا لیکن بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے اوائل میں یہ دو شاعر غزل کے آہنگ میں شعوری طور پر ایک نئے تجربے کا آغاز کر رہے تھے۔

(حفیظ الرحمن خان۔ مشمولہ "خیال و نظر")

اسلم انصاری کی مطالعاتی جہتیں دور رس اور ادراک گہرا ہے۔ ان کے بقول میں نے مشرقی ادبیات سے اس بلند تر تصوریت کا اکتساب کیا ہے جس نے تلاش وتجربہ کے رہ نوردانِ تشنہ لب کو معانی کے سرچشموں تک پہنچایا۔ مغربی ادب سے میں نے زندگی کے حقائق کی گہری بصیرت اور حرف تازہ کی تلاش کا جذبہ حاصل کیا ہے یوں مشرق ومغرب کے قدیم وجدید معیاری اور مثالی تصورات اور شعر وادب کے فنی وقائق سے اخذ واکتساب نے ان کے قلب ونظر کو احساس کی نئی کیفیتوں، ادراک کی نئی جہتوں اور بصیرت کی نئی تہوں سے آشنا کیا۔ انہیں عمرانی علوم سے بھی گہری دلچسپی ہے اور تاریخ، فلسفہ، ثقافت اور علوم انسانی میں دست گاہ ہے۔ انہوں نے فکر و

فلسفہ کی ان تمام روایات و موثرات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے انسانی تہذیب کے ارتقائی عمل کو آگے بڑھایا اور انسان کو ان عالم گیر تصورات تک پہنچنے میں مدد دی ہے جن کے ساتھ آج بھی انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے اور مستقبل کے ساتھ وابستگی سے فن کی ارفعیت پیدا ہوتی ہے اور ارفعیت کے لیے جن ممکنات کی ضرورت ہے اسلم انصاری کی شخصیت ان کی حامل ہے۔

(ڈاکٹر مختار ظفر۔مشمولہ ''اشارت'')

میں اسلوبِ شعری کی سطح پر اسلم انصاری کو غالب کی روایت سے وابستہ خیال کرتا ہوں کہ اس کے کالم میں وجدانی اظہار، فکری تجزیے سے آمیخت ہو کر قالبِ شعر میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری نوعِ انسان کے جبر و اختیار کی بے مثل کہانی ہے۔اس کے کلام میں کائنات میں جاری و ساری اور کائنات سے ماورا اعمال کو موضوع بنایا گیا ہے۔زندگی کی ماہیت کو سمجھنے کی سعی کرنا اور وقت کے تسلسل کے اسرار کی خبر لانا، اس کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے جس کے ڈانڈے خواب، حقیقتِ خواب اور ورائے خواب بصیرتوں سے ملے ہیں وہ خواب و آگہی کے مقام اتصال پر کھڑا، وصالِ یار کی کم یاب ہوتی ہوئی ساعتوں کو اپنے طلسمی عصا سے چھو کر امر کرنے کی تگ و دو میں الجھا دکھائی دیتا ہے۔وہ اس امر سے آگاہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی جستجو کا ماحصل دوامی دکھ کے سوا کچھ اور نہیں۔

(غلام حسین ساجد۔مشمولہ ''تائید'')

اسلوبِ غزل وسیع تر دروں بینی اور جذبۂ صادق کی کشید کا طالب ہے۔اگر یہ نقوش پیرایۂ غزل میں پھیکے ہوں تو پیکرِ غزل میں احساسات اور جذبات کی پختگی اور اظہار و ابلاغ کا گوہر تلاش نہیں کیا جا سکتا۔غزل میں ہمہ گیر نفسیاتی کیفیت کی موجودگی اور جذباتی تسلسل بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔یہ تسلسل ذاتی بھی ہو سکتا ہے اور کائناتی بھی۔یعنی داخلی بھی اور خارجی بھی ماورائی بھی ہو سکتا ہے اور لاماورائی بھی، فکری بھی ہو سکتا ہے اور تجرباتی بھی دراصل یہی جذباتی تسلسل ہے جو جدیدیت اور روایت کو ملانے والی کڑی ہے۔اسلم انصاری عہدِ جدید کا شاعر ہے۔جس

کے لب و لہجے میں جدیدیت کا آہنگ صاف اور واضح سنائی دیتا ہے۔ لیکن اس جدید لب و لہجے میں عہدِ گزشتہ کے سروں کی کھنک بھی موجود ہے۔ وہ اپنے ماضی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ اس کو حال اور مستقبل کے تمام تر امکانات سے منطبق کر کے پیش کرتا ہے۔ یوں تو اسلم انصاری کے تغزل کا محور کائنات کے ان گنت حقائق ہیں لیکن اس کی شاعری میں شعر و سخن کا سدا بہار موضوع ''حسن و عشق'' پوری طرح جلوہ فرما ہے۔

(مبین مرزا۔مضمون مشمولہ سہ ماہی ''فنون'' لاہور)

اسلم انصاری اپنی غزل میں محبت جیسی آفاقی قدر کا اثبات ذاتی، سماجی اور کائناتی حوالوں سے کرتا ہے۔ وسیع تر معنوں میں اس کے یہاں محبت اپنی سماجی شکل میں غمِ جاناں سے شروع ہو کر غمِ دوراں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

(ڈاکٹر نجیب جمال۔ مضمون مشمولہ سہ ماہی ''فنون'' لاہور)

جن شخصیات نے ساٹھ کی دہائی میں بڑے بڑے اور نام ور لکھنے والوں کے درمیان رہ کر اپنا لوہا منوایا ان میں اسلم انصاری ایسا نام ہے جس کے ساتھ میرے خیال میں ان کی برادری نے انصاف نہیں کیا۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ شناساؤں کی ناشناسی وہ تازیانہ تھی جو انصاری صاحب کی عزلت پسندی کو اور مہمیز کرتی رہی۔ پھر ان دونوں نے مل کر کئی اور عناصر سے گٹھ جوڑ کر لیا اور یہ سب بالآخر مستقل نہ سہی، کلیتاً نہ سہی عارضی اور جزوی طور پر نظر انداز کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ ورنہ اور سوالات کو چھوڑیے خود یہ سوال کہ ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' کی زمین کو سب سے پہلے کن بوندوں نے سیراب کیا اردو تنقید کے لے کافی اہمیت کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ کیا یہ بات نظر انداز کرنے کے قابل ہے کہ انصاری صاحب کی کئی ایک غزلیں جن کا آہنگ ہو بہ ہو ''پہلی بارش'' کا ہے، ناصر کاظمی کی ان غزلوں سے پہلے لکھی گئی تھیں اور طبع بھی ہوئی تھیں پھر اسلم انصاری کی بے شمار کام یاب غزلیں اور جاں گداز نظمیں اس اشہب قلم کو ظاہر کرتی ہیں جو یکساں سہولت

کے ساتھ دونوں میدانوں میں اپنی رفتار کے ثبوت چھوڑ جاتا ہے۔

(سعود عثمانی۔ مشمولہ "گفتگو کا چراغ")

اسلم بے حد جمال پرست تھے۔ اچھی صورت، اچھی آواز، اچھا رنگ، اچھی تصویر، اچھی تحریر، اچھی فلم کے بے ساختہ مداح۔ ہر طرح کی بدصورتی سے سخت نفور، لیکن شائستگی کے سبب سب سے زیادہ برداشت کرنے والے۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ فراق گورکھپوری اور قرۃ العین حیدر سے خاص شغف تھا۔ وولز ہاسٹل کے کمروں میں یک جا بیٹھ کر ہم نے کس قدر باتیں کیں۔ شعر کہے، سنے اور سنائے اور ان صحبتوں میں ہمارے ادبی ذوق کے خطوط کس طرح معین ہوئے۔ یہ سب کچھ گو سال بھر کے دورانیے کی بات ہے مگر عمروں پر محیط ہے۔ ۱۹۶۱ء میں سب سے پہلے میں اس منڈلی سے رخصت ہوا تو یہ کل ایک برس کی یک جائی مدتوں میرے حواس پر غالب رہی اور ویسا ربط پھر کبھی کہیں پیدا نہ ہو سکا۔ برسوں پہلے کی ان صحبتوں کے نقوش آج بھی گاہے گاہے دیوارِ دل پر جگ مگا اُٹھتے ہیں تو عجیب ہوک سی اُٹھتی ہے۔

(ڈاکٹر خورشید رضوی۔ مشمولہ "گفتگو کا چراغ")

اسلم انصاری نے اقبال کے رنگِ سخن کی تقلید کی ہے لیکن یہ تقلید دراصل ایک نئی طرز کی تشکیل ہے۔ ان کا مجموعہ فکرِ اقبال کی نئی شعری تشکیلات پر مبنی ہے۔ فکرِ اقبال کی یہ شاعرانہ ترجمانی جہاں تحسین اور ستائش کا حق ادا کرتی ہے وہاں تفہیم اور تشریح کے علمی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کے بنیادی تصورات کو تخلیقی سطح پر قبول کرتے ہوئے ایک ایسا آئینہ خانہ تعمیر کیا ہے جس میں نت نئے عکس ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ محض اقبال کی فوقیت کا اعتراف نہیں بل کہ اقبال سے الفت کا اعلان بھی ہے اور شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بھی! اور اسی سبب سے ''منظوم اقبالیات'' میں یہ مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے

(ڈاکٹر وحید الرحمن خان۔ مضمون مشمولہ ماہ نامہ "قومی زبان" کراچی)

اسلم کے ہاں محبت جیسی قدر کا اظہار بھی ہمہ پہلو ہے کہ محبت کا گزر سماج اور کائنات کے بغیر اس کی ذات میں نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ ان سے کٹ کے اس تجربے کی حقیقت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ وہ محبت سے لطف لیتے ہوئے بھی دوستوں کی بے وفائی دھیان میں رکھتا ہے۔ اربابِ جنوں ہوتے ہوئے بھی انا رکھتا ہے۔ وقارِ محبت کے پیشِ نظر حرفِ تمنا کے رنگ کو کھلنے نہیں دیتا۔ چاندراتوں میں اپنے اور دوسرے سائے کو محوِ گفتگو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے وہ اپنے احساسِ جمال کے سبب ہر منظر میں حسن کو تلاش کر ہی لیتا ہے۔ محبت کا یہ تجربہ جب شعری روپ میں ڈھلتا ہے تو اسلم کی شاعری کو جمالیاتی اساس فراہم ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر جاوید اصغر۔ مشمولہ "گفتگو کا چراغ")

اسلم انصاری کی ''فیضانِ اقبال'' نقادانِ اقبال کے منتخب افکار و خیالات پر مبنی منظوم ریڈیائی تشکیل سب سے اہم اور منفرد نوعیت کی شعری تخلیق ہے۔ اس میں نقادانِ اقبال کے افکار و نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو اسلم انصاری کے فنِ شعر اور اقبالیات میں ان کی دست رس اور عبور رکنے پر دال ہے''

(ڈاکٹر اسد فیض۔ مشمولہ "ملتان میں اصال سیاسی کی روایت"

ڈاکٹر اسلم انصاری نے بڑی ذہانت اور قابل فہم شعور کے ساتھ اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت سی نئی جہتوں سے در وا کرتا ہے۔ اقبال کا فکر و فلسفہ شرق اقوام خصوصاً ایشیائی مسلمانوں کے لیے آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں تھا۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ مضمون مشمولہ "ترجمان القرآن")

دکتر انصاری، سراینده مثنوی "نگار خاطر" که از جمله سخنوران برجستهٔ کلاسیک چون نظامی، حافظ، سعدی و

خسرو و امثال آنها کسب فیض نموده و مخصوصاً از اقبالؒ الهام گرفته است، باسرودن این مثنوی جالب جذاب باثبات ر سانیده است که رود زایندهٔ فارسی و پسندیده ترین زبان زنده رود (اقبال) تاکنون در پاکستان در حال جریان است و در آینده نیز در جریان خواهد ماند.

(دکتر الیاس عشقی از "مثنوی نگار خاطر")

اسلم انصاری شیفته و فریفتهٔ شعر اصیل و هنر و فلسفه و عشق و عرفان است و زندگی پر معنویست وی دور همین محور پنجگانه میچرخد. او درویش وار گوشه ای گرفته و بدریای بی کنار خویشتن خویش فرور فته است. خوش بحال این فرزانهٔ و ارسته کی شور و سوز روز شبهایش هیچگاه برایگانی نمی انجامد و دامان خیالش همواره از گوهر هانی چون "چراغ لاله"، "سروش عجم"، "فرخنامه"، "اقبالنامه"، "نگار خاطر" می درخشد.

(دکتر معین نظامی از "نگار خاطر")

The cumulative effect of Aslam Ansari,s Poetry is that of softness and mellowness, a magic touch of the regret for the summers that have now melted into the gold and brown of a soporific autumn afternoon.

But as a modren Poet, he is intersely aware of

the present human situation....At last, there is a Pakistani Poet, who writes English, with a certain knowledge of the long and veriegated tradition of English Poetry, and yet remains true to his own milieu.

(by Prof B.D. Hyder from "Lotus and the Sand Waves)

ہم تجھے حاصلِ معمورۂ جاں جانتے ہیں
لیکن اس رمز کو سب لوگ کہاں جانتے ہیں

سایۂ تاک میں گو عمر گزاری ہم نے
پتے پتے کی مگر ہم بھی زباں جانتے ہیں

ہم نے دیکھا ہے بہاروں کا سلگنا، بجھنا
اس لیے شعلۂ ہستی کو دھواں جانتے ہیں

ہم بھی لوٹ آئے ہیں احباب کو رخصت کر کے
گو انھیں اب بھی قریبِ رگِ جاں جانتے ہیں

ہم بھی چند کھڑکیوں سے خواب چرا سکتے تھے
ہم بھی اس شہر میں کچھ چیدہ مکان جانتے ہیں

خار ہر چند ہوئے زیست ِ اور نگ ِ بہار
اہلِ گلشن اسے گلشن کا زیاں جانتے ہیں

تھک کے بیٹھے ہیں تو اب سود و زیاں یکساں ہے
کیا ہوا گر رہ و منزل کے نشاں جانتے ہیں

ہر قدم منظر رفتہ میں تجھے دیکھا ہے
ہم نہ ملنے کو بھی ملنے کا سماں جانتے ہیں

جس میں مقصودِ یقیں صرفِ تخیل ہی ہے
ہم تو اس طرح کے ایماں کو گماں جانتے ہیں

("نقش عهد و صال کا" سے انتخاب)

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

دور و نزدیک سے اُٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

گل بہ ہر رنگ تبسم کا گنہ گار رہا
زخم ہستی کا ، سوا اس کے مداوا بھی نہیں

کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں

بے نیازی سے کبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں

کس کو نیرنگیِ ایام کی صورت دکھلائیں
رنگ اُڑتا بھی نہیں، نقش ٹھہرتا بھی نہیں

اب تو اک رات ہے ہجراں کی دل و جاں پہ محیط
صبح کیسی، کہ ترے بعد اُجالا بھی نہیں

یا ہمیں کو نہ ملا اس کی حقیقت کا سراغ
یا سرا پردہ ٔ عالم میں کوئی تھا بھی نہیں

("خواب و آگہی" سے انتخاب)

میرے عزیزو، تمام دکھ ہے

(گوتم کا آخری وعظ)

مرے عزیزو،
مجھے محبت سے تکنے والو
مجھے عقیدت سے سننے والو
مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو
مرے الم آفریں تکلم سے انبساطِ تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو
بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر عبور پائے،
سکھوں کو تجے ہوئے بے مثال لوگو،
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھنے والو......عزیز بچو،......میں بجھ رہا ہوں
مرے عزیزو، میں جل چکا ہوں۔
مرے شعورِ حیات کا شعلۂ جہاں تاب بجھنے والا ہے
میرے کرموں کی آخری موج میری سانسوں میں گھل چکی ہے
میں اپنے ہونے کی آخری حد پہ آ گیا ہوں
تو سن رہے ہو، مرے عزیزو، میں جا رہا ہوں
میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چلا ہوں
کہ جتنا رونا تھا رو چلا ہوں
مجھے نہ اب انت کی خبر ہے، نہ اب کسی چیز پر نظر ہے

میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی کے، سکوت کامل کے، جہل مطلق......

(کہ علم مطلق ہے)......جہلِ مطلق کے بحرِ بے موج سے ملوں گا تو

انت ہوگا

اس التباسِ حیات کا، جو تمام دکھ ہے!

میں دکھ اٹھا کر......مرے عزیزو!......میں دکھ اٹھا کر

حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھ گیا ہوں: تمام دکھ ہے

وجود دکھ ہے، وجود کی یہ نمود دکھ ہے

حیات دکھ ہے، ممات دکھ ہے

یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے

شعور کیا ہے؟ اک التزام وجود ہے، اور وجود کا التزام دکھ ہے

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے

کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے

یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے

سکوت دکھ ہے، کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہ سکا ہے

کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے

یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے۔

مرے عزیزو، تمام دکھ ہے!

("خواب و آگہی" سے انتخاب)

تمام شہروں میں گفتگو کا چراغ ہم ہیں

تمام شہروں میں گفتگو کا چراغ ہم ہیں
تمام لوگوں میں ہم سری کا جواز ہم ہیں
تمام الفاظ جن سے نقدِ شعور کا احترام باقی ہے
سب عبارات، ذہن جن سے وجود کے تجربے کی شدت کو سوچتا ہے
انہیں صحیفوں سے مقتبس ہیں جو ہم نے اپنے لہو سے لکھے
وہ شہ سرائیں کہ جن کے آتش کدوں میں شعلے خنک ہواؤں سے کانپتے ہیں
انہیں صداؤں سے گونجتی ہیں، جو ہم نہ ہوتے تو سنگ بستہ سکوت کی بے نشاں سلیں تھیں
خوش آرزو لوگ جن کی آنکھوں میں خواب ہیں واقعی سحر کے
ہمارے لمحوں سے جھانکتے ہیں
ہمارے لمحے جو روشنی کا مراقبہ ہیں
ہمارے لمحے جو تیرگی کا مقاطعہ ہیں
ہمارے لمحے جو زندگی کا مکاشفہ ہیں
انہیں سے سیلِ زماں کے دھارے ابل رہے ہیں
انہیں سے تاریخ کا عمل اپنے سب اسالیب مانگتا ہے
سنو کہ نغمہ طراز ہم ہیں
تمام لوگوں میں ہم سری کا جواز ہم ہیں
تمام شہروں میں گفتگو کا چراغ ہم ہیں

("خواب و آگہی" سے انتخاب)

Moments before the heretic saint was

curcified

Some said, "Why Sayeth Thou, I am the

truth"?

The martyre-to-be of the self-hood aptly

replied:

"A lover of him I be, not a novice uncouth,

I never did say I was the Lord Almighty;

I only Proclaimed that "I" is no illusion

If "I" in itself is no more a reality,

Then "Thou" is no more, too. The infusion

of "I and Thou" is quite impossible. In view

of mine, the lover and the beloved are apart,

or else how "Love" in between would

ensure"?

"Ah, heretic, indeed!" they cried, "His

argument though, is smart"

(Selection From "Lotus and The Sand Waves"

by Aslam Ansari)

نقش وفا

دهم از ارض پاکستان سلامی بهر شعر آشنا در هر مقامی
بخاصه واقفان رمز گفتار بلحن حافظ و سعدی و عطار
خوشا غر دری از میهن پاك که از عشق است ونی از عقل چالاك
خوشا ایں نر گستان تمنا که خواهد التفات چشم بینا
خوشا سیر جهان خوش ادانی بدانش بر فزاید آشنانی
خدایا سبز کن گلزار شعرم بهاراں ده ببرگ و بار شعرم
خدایا میهن پاکم نگهدار بهر دیار شویارو مددگار
خدایا بی خزاں دار ایں چمن را بهر طرف چمن سروسمن را
سلام آشنا با آشنایاں رسد با احتر امانت فر اواں
به رویای جهان ارزو ها کنم روشن چراغ گفتگو ها
که گفتن از من و توفیضیاب است نه گفتن از من و تو درحجاب است

سخن گفتن پیام دوستداریست
گزین نقش وفارا استواریست

(مثنوی"نگار خاطر" کے انتخاب)

شاعری کیا ھے ؟ (ڈاکٹر اسلم انصاری کا ایک نثر پارہ)

شاعری بھی بعض مجردات (Abstractions) کی طرح وسیع اصطلاح اور بہت بڑی تعمیم ہے۔لفظ "حسن" کی طرح اس کا بھی کوئی اور چھور نہیں میلوں ٹھیلوں میں گائے جانے والی بولیوں اور لوک شاعری سے لے کر اس کلام تک جو ادبِ عالیہ کا حصہ بن چکا ہے، ہر چیز شاعری ہے۔میاں جرأت کی "چوما چاٹی" (بحوالۂ آب حیات) سے لے کر میر و غالب کے شعرِ ناب تک،شاعری ہی کے درجات یادوائر ہیں۔فیض کا کلام بھی شاعری ہے اور ایک فلمی گیت نگار کو بھی

اپنے ''کلام موزوں'' کے شاعری ہونے کا دعویٰ ہے۔ نظم، غزل، نظم آزاد، نظم معریٰ سے لے کر ہائیکو اور نثری نظم تک شاعری کے بے شمار اسالیب اور انداز ہیں۔ لیکن اصناف، اسالیب، تنوع بلکہ اختلاف و تضادات کا ایک بہت بڑا دائرہ ہے جس کے تمام مشتملات پر بجا یا بے جا طور پر شاعری کا اطلاق ہوتا ہے۔ ارسطو سے لے کر ایلیٹ تک، شاعری کی تشریح و توجیہ کرنے والوں، اور شاعری کا فلسفہ بیان کرنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ہے جس میں دنیا کے بعض ذہین ترین اور دانش مندترین افراد بھی شامل ہیں۔ خود مشرقی روایات ادب میں بھی ایسے نابغۂ روزگار لوگوں کی کمی نہیں رہی جنھوں نے شاعری کی ماہیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنقیدِ ادب کا ایک بہت بڑا حصہ شاعری کی ماہیت کو بیان کرنے اور شاعری کی تشریح کرنے کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے ایک ایسی وسیع اصطلاح کے عمومی اطلاقات میں ذاتی معانی یا ذاتی توجیہات کا تعین کرنا خاصا مشکل ہے۔ شاعری بنیادی طور پر تو زبان ہی کا عمل ہے۔ اس لیے میرے نزدیک شاعری زبان کے علم کے بغیر ممکن نہیں، اگر دوسرے فنون میں اس کی مشابہت تلاش کرنا چاہیں تو میں کہوں گا کہ ادبی نثر اداکاری ہے۔ جب کہ شاعری الفاظ کا رقص ہے، لیکن یہ ادھوری تشبیہ ہے اس لیے کہ شاعری بڑی حد تک الفاظ کی موسیقی بھی ہے۔ الفاظ کا ترنم ایک بہت واضح لیکن محدود پیرایہ ہے۔ شاعری کے تمام اجزا ہر سطح پر مترنم نہیں ہوتے، ایسا ہونا ممکن بھی نہیں لیکن شاعری اس سے زیادہ وسیع چیز ہے۔ اسے بنیادی طور پر الفاظ کی موسیقی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعری میں الفاظ کی غنائی قدر و قیمت ہی سب کچھ نہیں اس لیے کہ الفاظ کا رشتہ معانی کے ساتھ ہے۔ میرے نزدیک شاعری میں اگر چہ عام طور پر معانی بیان کیے جاتے ہیں لیکن بلند پایہ شاعری میں معانی تخلیق بھی کیے جاتے ہیں۔ شاعری میرے نزدیک صرف حقائق حیات کی تعبیر ہی نہیں، حقائق حیات کی تشکیل بھی ہے۔ شاعری کو میں معنی آفرینی ہی کا نہیں بلکہ صداقت یابی کا عمل بھی سمجھتا ہوں، وہ صداقت جو منطق، فلسفہ، گرامر اور خطابت کی گرفت میں نہیں آتی۔ وہ صداقت جو مکتبی یا مروج ذرائع ابلاغ کے افق سے ماورا رہتی ہے۔ وہ صداقت جو سائنس کے دائرہ کار میں تو آتی

ہے لیکن سائنسی مشاہدے کی آنکھ سے مسلسل گریزاں اور اوجھل رہتی ہے۔ صرف شاعری ہی اس صداقت کو دریافت کرنے اور بیان کرنے کا دعویٰ کرسکتی ہے۔ شاعری زبان کی ایک الگ فریکوئنسی ہے۔ یہ زبان کا ایسا طول موج ہے جو زبان کو اس کے عمومی وظائف کی سطح سے اُٹھا کر ایک ایسے جہانِ معنی میں لے جاتا ہے جہاں حقائق، سائنسی حقائق نہیں بلکہ تخلیقی امکانات کے تشابہ پیکروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ شاعری میرے نزدیک شعور اور زبان کی بلندترین سطحوں کو ظاہر کرنے کا ایک بہترین صیغۂ اظہار ہے۔

ذاتی حوالے سے شاعری میرے نزدیک (عبادت اور محبت کے بعد) زندگی کی بہترین اور بلندترین سرگرمی ہے جو اظہارِ ذات کے فطری جذبے کی صحت مندانہ تسکین کا باعث ہوسکتی ہے۔ زبان جس عمومی انداز میں معاشرے میں بولی جاتی ہے اس میں الفاظ عام طور پر ایک طرح کے خارجی جبر اور فرسودگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ شاعری میرے لیے زبان کے عمومی خارجی عمل کی جبریت اور عام مفاہیم کی تنگنائے سے رہائی پانے کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک طرح کا لسانی کشف ہے جس میں لفظ اور معنی کی دوئی باقی نہیں رہتی، اور وہ وحدت اور ہم آہنگی جو انسان کی مضطرب روح کا ازل سے مطمحِ نظر ہے ایک کامیاب شعری تخلیق میں اپنا عکس دکھاتی ہے۔ شاعری ہی وہ ''ذریعۂ ابلاغ'' ہے جس کے ذریعے آپ انسان کے دماغ ہی نہیں اس کی روح سے بھی ہم کلام ہوسکتے ہیں۔ یہ وہ خود کلامی ہے جس میں ہم کلامی کے سارے قرینے موجود ہیں۔ یہ روح کی گہرائیوں میں اترنے کا وہ سنہری زینہ ہے جو افق اور پاتال دونوں کو ایک ہی جگہ ملاتا ہے۔ شاعری وہ نغمہ فریاد ہے جسے بعض اوقات ایک فرد ایک معاشرہ یا ایک عہد بے شک سننے سے انکار کردیں لیکن آنے والے سب زمانے اس کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوسکتے ہیں۔ یہ وہ آواز ہے جس کی گونج ماضی، حال اور مستقبل کے فاصلوں کو مٹا دیتی ہے۔ شاعری ''اظہار'' کا ایک انوکھا تجربہ ہے۔ اس میں انسان اپنے آپ کو ''زبان'' میں اور زبان اپنے آپ کو ''انسان'' میں دریافت کرتے ہیں، یہ کسی آفاقی نغمے کی بازگشت ہے جسے ہر شاعر اپنے انداز میں سنتا ہے اور

اپنے ''سازِ شاعری'' پر سناتا ہے۔ شاعری الفاظ سے بنائی ہوئی وہ تصویر ہے جو بولتی بھی ہے اور بولے جانے والے الفاظ کی آوازوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی رکھتی ہے شاعری وہ گیت ہے جسے زبان خود گاتی ہے۔ یہ فلسفی سے بڑھ کر صداقت شعار، مصور سے بڑھ کر نقش نگار، مغنی سے بڑھ کر نغمہ طراز اور معلم سے بڑھ کر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ شاعری ہو، الفاظ کی بے روح، بے جان اور بے زبان قطاریں نہ ہوں، اصل شاعری انسان کی آواز میں انسانیت کا لہجہ ہے لفظ جب اپنی لغوی حدود سے اوپر اُٹھنے کی، زبان کی ابلاغی فرسودگی سے ماورا ہو جانے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں تو وہ فوری طور پر شاعری یا شاعری کے اجزا بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب شاعری کوئی ''شاعر'' تخلیق کر رہا ہو۔ عربوں کے نزدیک شاعری شعور سے مشتق ہے۔ میرے نزدیک بھی شاعری شعور کی بلند ترین اور لطیف ترین کیفیت ہے جو شعور کی دوسری تمام حالتوں یا سطحوں کی جامع بھی ہے۔ اور ان سے بلند تر بھی اگر اسے ایک طرف میں زبان کا لطیف ترین نغمہ کہتا ہوں تو دوسری طرف شعور کی حیات آفریں بہار بھی کہتا ہوں۔ شاعری زبان کا وہ نغماتی گلشن ہے جس میں معانی کے نئے سے نئے پھول کھلتے ہیں اور انسان ان پھولوں کو اپنے دامنِ فکر میں بھر کر خود کو زیادہ مکمل محسوس کرتا ہے اور زندگی کو زیادہ لائق آرزو!

(''تکلّمات'' میں سے انتخاب)

کتابیات

ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتب

۱۔ ادبیاتِ عالم میں سیرِ افلاک کی روایت، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

۲۔ اُردو شاعری میں المیہ تصورات، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء

۳۔ اقبال عہد آفریں، ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۷ء

۴۔ تکلمات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء

۵۔ چوھدری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی، لاہور: دارالکتاب، ۲۰۰۸ء

۶۔ خواب و آگہی، ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء

۷۔ شعر و فکرِ اقبال، ملتان: مجلس فکرِ اقبال، ۱۹۹۹ء

۸۔ فیضانِ اقبال، ملتان: مجلس فکرِ اقبال، ۱۹۹۷ء

۹۔ مثنوی نگارِ خاطر، لاہور: ناشران خاوران، ۲۰۰۵ء

۱۰۔ نقشِ عہدِ وصال کا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

۱۱۔ Lotus and the sand waves, Multan: The Light House Academy, 1998, A.D

ڈاکٹر اسلم انصاری اور ان کے فن پر شائع ہونے والے مضامین اور کتابیں

۱۔ جابر علی، سید، استعارے کے چار شہر، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۴ء

۲۔ جاوید اصغر، گفتگو کا چراغ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء

۳۔ حفیظ الرحمٰن خان، خیال ونظر، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۹ء

۴۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، ''اُردو غزل کے نئے زاویے''، سہ ماہی، فنون، لاہور: جدید غزل نمبر، ۱۹۸۷ء

۵۔ عبدالرؤف، ''اسلم انصاری کی غزل'' ماہ نامہ، ماہ نو، لاہور: جولائی ۲۰۰۸ء

۶۔ عبدالرؤف، ''اسلم انصاری کی نظم''، سہ ماہی، الزبیر، بہاول پور: شمارہ ۴، ۲۰۰۸ء

۷۔ غلام حسین، ساجد، تائید، لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۱۹۹۶ء

۸۔ کیفی، پنڈت، کیفیہ، لاہور: عزیز بک ڈپو، ۱۹۵۵ء

۹۔ مبین مرزا، ندیم، ''اسلم انصاری کا شعری تناظر''، سہ ماہی، فنون، لاہور: شمارہ ۲۴، سال نامہ ۱۹۸۶ء

۱۰۔ محمد ارشاد، ''رباعی کی تکنیک اور فن''، ماہ نامہ، بیاض، لاہور: فروری ۲۰۰۹ء

۱۱۔ مختار ظفر، ڈاکٹر، ''اسلم انصاری کے شخصی و تخلیقی رنگ''، ادبی سلسلہ، اشارت، ملتان: ۱۹۹۷ء

۱۲۔ وحید الرحمٰن خان، ڈاکٹر، ''فیضان اقبال کی ایک روشن مثال''، ماہ نامہ، قومی زبان، کراچی: جلد ۷۹، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۷ء

۱۳۔ وحید الرحمٰن خان، ڈاکٹر، ''چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی'' ماہ نامہ، قومی زبان، کراچی: جلد ۸۰، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۸ء

دیگر کتب

۱۔ فرہنگِ جامع (فارسی ۔ انگلیسی)، تہران: کتابفروشی یہودا بروخیم، ۱۳۴۱ء، ج ۱

۲۔ The Teaching of Buddha, Tokyo: Kasaido Printing Co Ltd, 1995 A.D